

بھٹو اور مجیب کی مُلاقات

مضمون صفحہ ۵ پر ملاحظہ فرمائیں

قیمت: مغربی پاکستان = ۵۰ پیسے
مشرقی پاکستان = ۶۰ پیسے

۷ — ۱۴ جنوری ۱۹۷۱ء

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ

الفتح

کراچی

جلد:- ۱ شمارہ:- ۳۴

۷ر — ۱۴ر جنوری ۱۹۷۱ء

نگرانِ اعلیٰ

شوکت صدیقی



مدیر

ارشاد راؤ



معاونین خصوصی

صفدر میر — منہاج برنا

مجلسِ ادارت

محمود شام - اشرف شاد - وہاب صدیقی

بحرین، کویت ——— ۶۰ فلس
دوبئی، قطر ——— ۷۵ درہم
سعودی عرب ——— ۱۵ قرش
انگلستان ——— ۲ شلنگ، ۶ پنس

معاشی قتلِ عام

ملک بھر میں بالعموم اور مغربی پاکستان میں بالخصوص مزدوروں، کسانوں اور مظلوم طبقے کے دوسرے شہریوں کے ہاتھوں انتخابی محاذ پر ذلت آمیز شکست کھانے کے بعد صنعت کار، سرمایہ دار اور جاگیردار معاشی بحران میں شدت پیدا کرنے کے لیے ہر ممکن ہتھکنڈوں سے کام لے رہے ہیں۔ روزمرہ کے استعمال کی اشیاء کی قیمتوں میں اچانک کئی سو گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ تیزی کے ساتھ بھاؤ بڑھ رہے ہیں۔ عام چیزیں مارکیٹ سے غائب ہو رہی ہیں۔ روٹی، کپڑا اور مکان کے حق میں فیصلہ دینے والوں پر ایسی آزمائش آن پڑی ہے کہ وہ قحط کی سی صورتِ حال سے دوچار ہو گئے ہیں۔

ایک طرف عوام دشمن طاقتیں معاشی قتل عام پر تلی ہوئی ہیں تو دوسری طرف اسے مزید تقویت پہنچانے کے لیے مزدوروں اور کسانوں پر روزگار کے دروازے بند کیے جا رہے ہیں۔ ملوں میں وسیع پیمانے پر چھانٹی اور کسانوں پر حالیہ مظالم ایسی خوفناک تصویر پیش کر رہے ہیں کہ اقتدار کی منتقلی اور آئین سازی کا مرحلہ طے ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ سیاسی انتقام کی یہ لہر اب یک ہر کوچے، ہر گلی اور ہر دیہات کو پوری آب و تاب سے اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ سندھ بلبلا اُٹھا ہے۔ پنجاب چیخ رہا ہے۔ سرحد میں کسان کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے اور بلوچستان پِس رہا ہے۔

نیشنل پریس ٹرسٹ کے ناسور کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کرنے کا



	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
مغربی پاکستان	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
مشرقی پاکستان	۶۰ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

خط و کتابت کے لئے

دفتر ہفت روزہ "الفتح" ۸۷ ڈی- زرسری کمرشل ایریا- پی، ای، سی، ایچ، ایس- کراچی ۲۹

ایڈیٹر پبلشر ارشاد راؤ۔ مطبع حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد کراچی

مقام اشاعت: ۸۷ ڈی زرسری کمرشل ایریا، پی ای سی ایچ ایس- کراچی ۲۹

مطالبہ ہُوا ہی تھا کہ پی پی ایل پر سومار نے شب خون مار دیا۔ ایس اے رحمان کے ہاتھ درجنوں ملازمین کے معاشی قتل کے خون سے رنگے جا چکے ہیں۔ اس نے ابھی تک چھُری کو پھینکا نہیں بلکہ دھار تیز کرکے مذبح کی شان دوبالا کر رہا ہے۔ اس کی خونی آنکھوں کے سامنے جس مظلوم کا جسم چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اُسے معاشی قتل گاہ کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ اس قتلِ عام پر پورا پاکستان لرز اُٹھا ہے۔ پی پی ایل یونین کے صدر صفدر میر، متعدد سیاسی کارکن اور طلبہ تنظیں اُنھیں بچانے کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرنے کا اعلان کر چکی ہیں، لیکن وہ طاقتور ہاتھ ابھی تک خاموش ہے جو ایس اے رحمان کی گردن پکڑ سکتا ہے اور وہ ہاتھ اُٹھنے والے ہیں جنھوں نے بساطِ سیاست کی کایا پلٹ دی ہے۔ کاش! طاقتور ہاتھ ایس اے رحمان کو دبوچ لے اور ملک ایوب آمریت کے آخری ایام کی کیفیت سے دو چار نہ ہو۔

ایس اے رحمان اپنے میدان میں مذبح سجائے ہُوئے ہے تو ل مالکان اپنے ہتھیار استعمال کر رہے ہیں۔ اُن کی چھُری بھی کم تیز نہیں۔ پشاور کا یاسمین آباد خوانین کے 'مقتولین' کی جیتی جاگتی تصویر پیش کر رہا ہے۔ ایڈنگ ہسپتال میں ڈاکٹر خونی جسموں کی مرہم پٹی کر رہے ہیں

کراچی یونیورسٹی پر بھی اچانک آفت آ پڑی ہے۔ اشتیاق حسین قریشی اپنے مربی اور محسن مولانا مودودی کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے اساتذہ کے معاشی قتل عام کی بھرپُور تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اساتذہ سخت کرب میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے اعلان کر دیا ہے کہ ۱۵ر جنوری تک یونیورسٹی آرڈیننس منسوخ نہ کیا گیا تو وہ غیر معینہ مدت کے لیے ہڑتال کر دیں گے۔ اساتذہ کے وفود اخبارات کے دفاتر میں پہنچ رہے ہیں۔ کہ وائس چانسلر سیاسی انتقام کا نشانہ بنانے کے لیے آرڈیننس کی آڑ میں اُن اساتذہ کو برطرف کرنا چاہتے ہیں جو مودودی صاحب کے لیے انتخاب میں مؤثر کارگزاری کا مظاہرہ نہیں کر پائے یا جنھوں نے اس کام کو اپنے منصب کے خلاف قرار دیکر اُسے یکسر ٹھکرا دیا۔

ملک بالخصوص مغربی پاکستان میں ایس اے رحمان، سومار، اشتیاق حسین قریشی اور صنعت کار صرف چہرے ہیں جن کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ خفیہ ہاتھ عوام کی نظروں سے اوجھل ہے۔ وہ سامراج ہے جس نے اس قسم کی صورتِ حال پیدا کرکے بے چینی و اضطراب کے عالم میں اپنی سازشوں کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ پاکستان میں بائیں بازو کی طاقتوں کی شاندار فتح نے اُسے مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنا کھیل دُوسرے انداز سے شروع کرے۔ وہ اس غلط فہمی کا بُری طرح شکار ہے کہ ملک میں دُوسرا مارشل لا نافذ ہو جائے گا۔ شاید وہ یہ بھول رہا ہے کہ پاکستانی افواج اقتدار عوام کو منتقل کرنے کا عزم کیے ہُوئے ہیں۔ اس کا ایک اور مارشل لار کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

یہ قطعی ممکن ہے کہ موجودہ صورتِ حال جاری رہی تو عوام دوست طاقتیں ایک بار پھر اپنا تاریخی کردار ادا کریں۔ اس عمل میں پاکستان کو 'انڈونیشیا' بنانے والوں کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں گے اور پاکستان سامراج کا قبرستان ثابت ہوگا۔ گماشتہ سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور سامراجی دلالوں کو عوام فیصلے کا احترام کرنا پڑے گا، ورنہ وہ نوشتۂ تقدیر پڑھ لیں۔ امریکی سامراج کو پاکستان کے عوام نے ٹھکرا دیا ہے، اس کے گلے سڑے نظام کو دفنانے کی مکمل تیاریاں کر چکے ہیں۔

۱۹۷۰ء عوامی جدوجہد کا وہ باب ہے، جسے خون سے عبارت کیا گیا ہے۔ اس کی روشنی کو اجاگر کرنے کے لیے مزید خون دینے سے دریغ نہیں کیا جائے گا۔ ۱۹۷۱ء عوام کے لیے نیا سال ضرور ہے لیکن وہ اب کے برس بھی اپنا حصّہ پُورا لیں گے۔ ظلم کی سیاہ رات ان کے حوصلوں کو پست نہیں کر سکتی۔ اب ہر سال عوام کا سال ثابت ہوگا اور ہر سال امریکی سامراج اور اُس کے دلالوں کے لیے موت کا پیغام لے کر طلوع ہوگا۔

ہم عوام کو روشن ایام کی آمد پر مبارک باد پیش کرتے ہیں اور سامراج، سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور اُن کے دلالوں کے خلاف شانہ بشانہ لڑتے رہنے کا عہد کرتے ہیں



رمنا ریس کورس گراؤنڈ میں مجیب الرحمٰن کی تقریر اور اس کا تجزیہ

مجیب بھٹو کو لڑوانے والے نوشتۂ دیوار پڑھ لیں!

م ـ ش

مشرقی پاکستان کے صوبے سے سب سے زیادہ نشستیں حاصل کرنے والی سیاسی پارٹی عوامی لیگ کے رہنما شیخ مجیب الرحمان نے اپنے منتخب نمائندوں کی رسم حلف برداری کے موقع پر بیس لاکھ کے قریب افراد سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ عظیم تر مفادات کی خاطر پاکستان کا آئین عوامی لیگ کے چھ نکات کی بنیاد پر تیار کیا جائے گا۔ آئین سازی میں مغربی پاکستان کے نمائندوں کا تعاون حاصل کیا جائے گا۔ ملک میں سوشلسٹ اقتصادی نظام قائم کیا جائے گا۔ بنک، بیمہ کمپنیوں اور پٹ سن کی تجارت کو قومی تحویل میں لے لیا جائے گا۔ مزدوروں کو کارخانوں میں حصہ دار بنایا جائے گا۔ مغربی پاکستان کے غریبوں کا استحصال بھی ختم ہوگا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام کے مسائل ایک سے ہیں۔"

شیخ مجیب الرحمان کے اس بیان سے مغربی پاکستان میں عام طور پر خوشگوار تاثر کا اظہار کیا جائے گا کیوں کہ شیخ مجیب الرحمان نے نہایت دانش مندی اور حقیقت پسندی سے ان حقائق کا اعتراف کیا ہے کہ ان کی جماعت کو بنگلہ دیش کے عوام نے منتخب کیا ہے۔ ہم نے لکھا تھا کہ بنگال میں مغربی پاکستان کی طرح انتخابات نہیں، ریفرنڈم ہوا ہے۔ شیخ مجیب الرحمان نے بھی اپنی تقریر میں اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے۔ "بنگلہ دیش کے عوام نے ریفرنڈم میں چھ نکات اور گیارہ نکات کے پروگرام کے حق میں فیصلہ دیدیا ہے۔" انہوں نے یہ بھی کہا "ہم جمہوریت پر یقین رکھتے ہیں اور جمہوریت چاہتے ہیں۔ ہماری نہ صرف بنگال میں اکثریت ہے بلکہ پورے پاکستان میں ہماری اکثریت ہے کسی کو یہ بات نہیں بھولنا چاہیئے، لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ ہم اکثریت میں ہیں اس لئے ہمیں آئین سازی میں کسی کے تعاون کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے مغربی پاکستان کے نمائندوں کے تعاون کی ضرورت ہے لیکن اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا اور ہم مغربی پاکستان کے نمائندوں کے تعاون سے آئین تیار کریں گے۔"

اس سے پہلے وہ مغربی پاکستان کے دو بڑے صوبوں پنجاب اور سندھ سے اکثریتی نشستیں جیتنے والی جماعت پیپلز پارٹی کے سربراہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے ایلچی مسٹر غلام مصطفےٰ کھر سے بھٹو کے پیغام کے جواب میں کہہ چکے ہیں "کہ میں اور مسٹر بھٹو مل کر جمہوریت کی بحالی کے لئے کام کریں گے۔" مغربی پاکستان کی نمائندگی کا جہاں تک تعلق ہے، اس کا حق مسٹر بھٹو کی پارٹی سے زیادہ اور کسی کو نہیں پہنچتا کیوں کہ اس نے دو بڑے صوبوں یعنی ۱۴۳ نشستوں میں سے ۱۰۹ نشستوں والے صوبوں میں ۸۱ نشستیں حاصل کی ہیں، اور جس طرح مسٹر بھٹو نے کہا تھا کہ اگر ہم یقیناً زیادہ سیٹیں حاصل کر لیتے، اور پھر میں مسٹر نورالامین سے کہتا آؤ تم بنگال تم بنگال کی آواز ہو۔ میں تم سے اشتراک عمل کرتا ہوں" مطلب یہ کہ جس طرح نورالامین کو ایک سیٹ کے ساتھ مشرقی پاکستان کی نمائندگی کا حق نہیں مل سکتا، اس طرح مسٹر دولتانہ، ولی خاں، مفتی محمود صاحب کو چند سیٹوں کے ساتھ مغربی پاکستان کی نمائندگی کا حق نہیں مل سکتا، مجیب اور بھٹو کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کی کوششوں میں مصروف وطن دشمن عناصر کو اب نوشتۂ دیوار پڑھ لینا چاہیئے۔ شیخ مجیب الرحمان کی اس تقریر کو بھی جماعت اسلامی کے اخبارات نے اپنے مطلب کے مطابق فلیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ "جسارت" کی شہ سرخیوں میں "مغربی پاکستان کے نمائندوں کے تعاون سے آئین بنایا جائے گا" کو جگہ نہیں دی۔ بلکہ اس بات کو ہوا دی ہے "کہ مغربی پاکستان کے رہنماؤں سے اصولوں پر سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔"

شیخ صاحب کی اس تقریر کے نکات سے مغربی پاکستان کے سیاسی حلقوں کو کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ جن بنیادی نکات پر انہوں نے زور دیا ہے، اس سے مغربی پاکستان کی اکثریتی جماعت کو کوئی اختلاف نہیں کیونکہ پاکستان پیپلز پارٹی ان نکات کی سب سے زیادہ علمبردار رہی ہے۔ ملک میں سوشلسٹ معاشی نظام کے قیام کے بارے میں بھٹو نے ۲۷ دسمبر کو کہا تھا، مشرقی اور مغربی پاکستان کو صرف سوشلسٹ معاشی نظام متحد رکھ سکتا ہے۔ بنک، بیمہ کمپنیوں، پٹ سن کی تجارت تمباکو کی تجارت کو قومی ملکیت میں لینے کا عہد بھی سب سے زیادہ پیپلز پارٹی نے کیا ہے۔ زمینوں کی ملکیت کی حدود کے تعین کا ذکر بھی پیپلز پارٹی کے منشور میں موجود ہے۔ جب

عوامی لیگ کے سربراہ نے چھ نکات کے متنازعہ حصے پر زور نہیں دیا

سوشلسٹ معاشی نظام کے قیام کی بات ہوگی تو اس کے بعد کوئی اختلاف کی گنجائش نہیں رہتی۔ سوشلسٹ معاشی نظام۔ کے سامنے کسی نکتے کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ سوشلسٹ معاشی نظام کے لئے وفاقی دستور کی ضرورت ہے۔ تمام سوشلسٹ ممالک میں فیڈریشن کا وجود ہے۔ فیڈریشن کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ ان اصولوں کے بغیر فیڈریشن نہیں چل سکتی، اور فیڈریشن کے بغیر سوشلسٹ معاشی نظام نہیں چل سکتا۔

اس تقریر کا ایک اور قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ چھ نکات کے جو متنازعہ فیہ حصے ہیں ان پر شیخ مجیب الرحمان نے زور نہیں دیا۔ صوبوں کی بیرونی ملکوں سے تجارت اور خارجہ پالیسی میں خود مختاری کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی یہ کہا ہے کہ کرنسی الگ الگ ہوگی۔ بھارت کے ساتھ دوستی کا اعلان کیا ہے تو ساتھ ہی فرخا اور کشمیر کے مسئلوں کا پرامن حل بھی مانگا ہے۔ شیخ مجیب الرحمان کے اندازِ فکر میں یہ تبدیلی ایک واضح بنیادی نشاندہی کرتی ہے۔ مغربی پاکستان کی اکثریتی جماعت نے مشرقی پاکستان کے بارے میں چونکہ معقول رویّہ اختیار کیا ہے، اس لئے مشرقی پاکستان کی اکثریتی جماعت بھی مغربی پاکستان کے بارے میں یہ طرزِ فکر اختیار کر رہی ہے۔ اگر مغربی پاکستان سے ایک جماعت اتنی اکثریت لے کر نہ جیتتی اور بعد میں مشرقی پاکستان کے مسائل پر حقیقت پسندانہ تبصرہ نہ کرتی۔ تو شاید عوامی لیگ کے سربراہ کا یہ طرزِ فکر نہ ہوتا ـــــــ

ایوب خاں آمریت کے آخری دنوں سے ہی ملک کے سنجیدہ سیاسی مبصّرین اور غیر ملکی مبصّرین کے سامنے کھل کر یہ بات آگئی تھی کہ اس ملک کی اکثریت کی قیادت صرف دو شخصیتیں کر رہی ہیں۔ بھٹو اور مجیب۔ اگرتلہ کیس کو ختم کر کے جب مجیب کی رہائی کا اعلان کیا گیا، تو مغربی پاکستان سے مسٹر بھٹو نے مجیب کو اشتراکِ عمل کی دعوت دی تھی اور اسی دعوت کے ساتھ وہ انہیں ملنے ڈھاکہ پہنچے، لیکن اس سے پہلے رجعت پرست طاقتوں کی طرف سے ایک نمائندے مسٹر اے کے بروہی (جنہیں ان انتخابات میں عبرتناک شکست ہوئی ہے) پہلے ہی ڈھاکے جا پہنچے اور انہوں نے مجیب سے رہائی سے چند گھنٹے پہلے جیل ہی میں ملاقات کی۔ بروہی صاحب کو ان طاقتوں نے بھجوایا تھا جو گول میز کانفرنس میں شرکت کر رہی تھیں۔ بروہی صاحب کا مشن صرف یہ تھا کہ مجیب کسی طرح بھٹو کے ساتھ اشتراکِ عمل کے لئے تیار نہ ہوں اور بھٹو کے کہنے پر گول میز کانفرنس میں شرکت سے انکار نہ کریں۔ (خیال رہے کہ اس سے پہلے مسٹر بھٹو نے اگرتلہ کیس میں مجیب کی پیروی کی پیش کش بھی کی تھی) بروہی صاحب اپنے مشن میں کامیاب رہے اور وہ اچھی طرح زہر بھر آئے، اور جب بعد میں مسٹر بھٹو پہنچے، اور وہ انہیں ساتھ لے کر لاہور تک آئے، تو ان کے منع کرنے کے باوجود مجیب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے تیار ہو گئے۔ مسٹر بھٹو کے ساتھ انہوں نے جلوس کی شکل میں لاہور شہر میں جانے کی پیش کش بھی قبول نہ کی، اور اپنے کسی دوست کی کار میں خاموشی سے چلے گئے۔ لیکن گول میز کانفرنس کے آخر میں انہیں اپنی غلطی اور بھٹو کا مشورہ نہ ماننے کا احساس ہوا۔ انہوں نے اپنی جماعت کو جمہوری مجلسِ عمل سے بھی الگ کرنے کا اعلان کیا اس کے بعد مشرقی پاکستان کے عوام نے گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے والی شخصیتوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ بھی عوام کے سامنے ہے، اس وقت جماعتِ اسلامی، دولتانہ اور دوسرے لیڈروں نے مجیب پر جو کچھ الزامات لگائے تھے، وہ اپنی جگہ ہیں، لیکن اس وقت یہ لوگ بھٹو اور مجیب کو دور رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ بعد میں مارشل لاء لگا۔ جمہوریت کی بحالی کے لئے سیاسی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ مشرقی پاکستان میں مجیب اور بھٹو نے اس کے لئے ان تھک سیاسی جدوجہد کی۔

لیکن اس بار بھی مجیب صاحب سندھ کی ایک سازشی اور علیحدگی پسند سیاسی شخصیت کے چکر میں آگئے کراچی آئے تو انہوں نے اس کی ضیافتیں قبول کیں۔ سندھ میں عوامی لیگ کی تنظیم بھی انہی کے اشاروں پر قائم کی گئی، جی، ایم سیّد خود تو شریک نہ ہوئے، اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو اس میں شریک کروا دیا۔ ان دنوں بھی جی ایم سیّد گروپ نے انہیں بھٹو کے قریب نہ جانے دیا۔ شیخ مجیب الرحمان نے عوامی لیگ کی تنظیم قائم کرنے کے لئے مغربی پاکستان کا دو بار دورہ کیا۔ لیکن اس کے کوئی مؤثر نتائج برآمد نہ ہوئے۔ بلکہ پیر پگاڑو گروپ جو عوامی لیگ میں شامل ہوا تھا بعد میں ٹوٹ کر قیوم لیگ سے جا ملا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی پاکستان سے شیخ مجیب کا کوئی مؤثر رابطہ قائم نہ ہونے دیا گیا۔ اس میں جماعت اسلامی، جی، ایم سیّد اور دوسری علیحدگی پسند طاقتیں، یوسف ہارون گروپ پیش پیش تھے۔ مقصد یہ تھا کہ اگر بھٹو اور مجیب مل گئے تو وہ نئی نسل کی بھرپور نمائندگی کرتے ہوئے استحصال کے خاتمہ کے لئے جدوجہد کریں گے جو یقیناً کامیاب ہوگی۔ اس لئے تمام استحصال پسند قوتوں نے مل جل کر انہیں دور رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ شیخ مجیب الرحمان جب کراچی آئے تو ان کی رہائش کا انتظام جس کوٹھی میں کیا گیا، اس کا کرایہ ۲۲ خاندانوں میں سے ایک نے ادا کیا تھا اور خیال ہے کہ اس کوٹھی میں پہلے "ڈان" کے ایڈیٹر جمیل انصاری کرایہ دار

باقی صفحہ ۴۰ پر

جئے بنگلہ جئے پاکستان

شیخ مجیب الرحمان نے اگرچہ کہا ہے کہ عوامی لیگ نے پورے پاکستان میں اکثریت حاصل کی ہے لیکن عوامی لیگ کے ارکان نے جو حلف اٹھایا، اس کا اختتام جئے بنگلہ اور جئے پاکستان پر ہوتا ہے۔ باقی چار صوبوں کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے، کیوں کہ عوامی لیگ کے نمائندے صرف ایک ہی صوبے مشرقی پاکستان سے منتخب ہوئے ہیں۔ ڈائس پر بادبان کی جگہ جو نقشہ بنایا گیا تھا وہ بھی صرف مشرقی پاکستان کا تھا۔

پیکنگ سے ایک خط

"ہم پاکستان کو مضبوط اور طاقتور دیکھنا چاہتے ہیں"

نمائندہ خصوصی

چین کے عظیم رہنما چیئرمین ماؤ اور صدر یحییٰ کی بات چیت

عظیم رہنما چیئرمین ماؤزے تنگ نے کہا۔

"چینی عوام پاکستان کی خوشحالی اور ترقی میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ جناب صدر، آپ اپنے ملک میں سب سے پہلے فولاد کے کارخانے قائم کرنے کی طرف توجہ دیجئے۔ اس سے نہ صرف عام آدمی کو روزگار میسّر ہوگا بلکہ غیر ممالک کی محتاجی سے نجات مل جائے گی۔ کوشش کا محور یہ ہونا چاہیئے کہ بیرونی امداد کی ضرورت نہ پڑے۔ کسی بھی ملک کا خودکفیل ہونا ضروری ہے، چین کے عوام خودکفیل پاکستان کی تعمیر میں پاکستانی عوام کا بھرپور ساتھ دیں گے۔ فولاد کے کارخانے کے قیام کے لئے چین ہر ممکن امداد بہم پہنچانے کو تیار ہے۔ جناب صدر، ہم اپنے دوست کو مضبوط اور طاقتور، بہت مضبوط اور بہت طاقتور دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ہماری دلی خواہش ہے، اس میں چین کے عوام کا خلوص

النصر

چین اور پاکستان کی دوستی سامراج کے خلاف جدوجہد کے دوران پروان چڑھی ہے

شامل ہے۔ ہم ہر حال میں پاکستانی عوام کے ساتھ ہیں۔"

پاکستانی عوام سے اپنی اور چینی عوام کی ان بے لوث اور مخلصانہ خواہشات کا اظہار چیئرمین ماؤزے تنگ نے صدر یحییٰ سے ملاقات کے دوران کیا۔ ذرا ملاحظہ کیجئے کہ عظیم عوامی جمہوریہ چین ۵۰ کروڑ عوام کے دلوں کی دھڑکن اور محبوب رہنما پاکستانیوں کے لئے کس قدر محبت اور دلی لگاؤ رکھتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح ایک بزرگ اپنوں کے لئے رچا ہے وہ دنیا کے کسی بھی خطہ میں کیوں نہ آباد ہوں، بھلائی اور خوشحالی کا متمنی ہوتا ہے۔ عظیم چین اپنے پڑوسی اور دوست پاکستان کو عظمت و سربلندی کے اس مقام پر دیکھنا چاہتا ہے جو آزاد قوموں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کے لئے وہ پاکستان کے سامنے شرائط نہیں رکھتا۔ کوئی پابندی عائد نہیں کرتا نہ ہی اس بات کو خاطر میں لاتا ہے کہ پاکستان کے داخلی معاملات کیا ہیں اور خارجہ پالیسی میں جھکاؤ کس طرف ہے۔ چنانچہ اسی ملاقات میں۔

عظیم رہنما چیئرمین ماؤزے تنگ نے کہا۔

"امریکہ چین کا بدترین دشمن ہے۔ بھارت، پاکستان کا دشمن نمبر ایک ہے۔ پاکستان کے امریکہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات ہیں لیکن چین کے بھارت سے دوستانہ تعلقات نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چین پاکستان کا دوست ہے، وہ پاکستان کے دشمن نمبر ایک سے کیسے دوستانہ تعلقات قائم کر سکتا ہے، جناب صدر، ہم آپ سے ہرگز نہیں کہیں گے کہ آپ امریکہ سے تعلقات ختم کریں۔ یہ آپ کا اپنا مسئلہ ہے۔ ہم تو اپنے دوست سے اپنے تعلقات مستحکم کرنے کے لئے پیش پیش ہیں۔ یہی دوستی کا تقاضا ہے۔ آپ کی خوشنودی میں ہی ہم خوش ہیں۔"

۱۳ نومبر ۱۹۷۰ء کی یہ ملاقات پاک چین دوستی کی بنیادوں کو مزید مضبوط کرنے میں یقیناً ایک سنگِ میل ثابت ہوگی۔ پاکستان کے صدر جنرل آغا محمد یحییٰ خان نے عظیم رہنما چیئرمین ماؤزے تنگ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان، چین کی دوستی کو کتنی فوقیت دیتا ہے۔ پاکستان چیئرمین ماؤزے تنگ کی عظمت کا کس حد تک معترف ہے۔ صدر یحییٰ کے ان کلمات نے تو بین الاقوامی سیاست کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔

"چیئرمین ماؤزے تنگ چین ہی نہیں بلکہ ایشیا کے عظیم رہنما ہیں"

پاکستان کے معزز مہمانوں نے چین میں اپنے قیام اور اس کے بعد اپنے ملک پہنچ کر جس نیک تمناؤں اور چیئرمین ماؤزے تنگ سے عقیدت کا اظہار کیا ہے، چینی عوام اس کے بہت مداح ہیں۔ بالخصوص صدر یحییٰ نے عظیم رہنما چیئرمین ماؤزے تنگ سے ملاقات کے بعد تقریبات میں جو باتیں کیں اس سے پتہ چلتا تھا کہ صدر صاحب ذاتی طور پر کس قدر متاثر ہیں۔ صدر پاکستان کے دل و دماغ میں ایک سچے دوست کے لئے اس سے کم جذبات نہ تھے اور وہ پاک چین تعلقات کی اہمیت کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔

صدر یحییٰ پاکستان کی دوسری بڑی شخصیت ہیں جن کا عظیم عوامی جمہوریہ چین میں اتنے جوش و خروش سے خیر مقدم کیا گیا۔ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ اتنا بڑا استقبال تو پہلی شخصیت مرحوم حسین شہید سہروردی کا بھی نہیں ہوا تھا۔

لاکھوں افراد اپنے معزز مہمانوں کو خوش آمدید کہنے

> **صدر یحییٰ ماؤزے تنگ سے ذاتی طور پر بہت متاثر ہے**

ائر پورٹ پر موجود تھے۔ جونہی پاکستانی مہمانوں کا طیارہ زمین پر اترا، ائرپورٹ تالیوں سے گونج اٹھا۔ چینی عوام نے خوشی میں رقص کیا اور گیت گائے۔ سڑکوں پر لاکھوں انقلابی پاکستان کے وفد کے منتظر تھے۔ کھلی کار میں وزیراعظم چو این لائی کے ہمراہ صدر پاکستان اور ان کے وفد کے ارکان سڑکوں پر سے گزرے تو دور دور تک دیکھنے کا منظر تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس سے بڑا خوشی کے اظہار کا کوئی دن نہیں۔ چین کے انقلابی عوام نے اپنے ہاتھوں میں چین اور پاکستان کے قومی جھنڈے تھامے ہوئے تھے۔ وہ پاک چین دوستی زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ ان کی زبان پر تھا "ہم ہر جارحیت کے خلاف پاکستان کے عوام کے ساتھ ہیں۔ ہم کشمیری عوام کے حق خودارادیت کی مکمل تائید کرتے ہیں۔ افریشیائی عوام کا اتحاد زندہ باد دنیا بھر کے عوام کا اتحاد زندہ باد" اس کے جواب میں صدر یحییٰ نے ہاتھ ہلا ہلا کر نعروں کا جواب دیا۔

اس روز چین کے اخبارات نے شاندار الفاظ میں معزز مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ اخبارات نے رائے دی کہ صدر یحییٰ کا دورۂ چین دونوں دوست ممالک کے تعلقات میں ایک نئے باب کا اضافہ کرے گا۔ رینمن ریباؤ نے دس نومبر ۱۹۷۰ء کو اپنے اداریہ "پاکستان کے معزز مہمانوں کا پرجوش خیر مقدم" میں لکھا۔

"چین اور پاکستان کی دوستی کی تاریخ میں صدر یحییٰ کا دورہ ایک اہم واقعہ کی حقیقت رکھتا ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ صدر یحییٰ کے اس دورے سے دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اور تعاون کے جذبات فروغ پائیں گے۔"

رینمن ریباؤ نے آگے چل کر لکھا "چین اور پاکستان دو پرانے ہمسائے ہیں۔ اور دوستی کے قدیمی رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ دوستی کے یہ رشتے ان پانچ اصولوں کی بنیاد پر استوار ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کی ملکی سالمیت کا احترام اندرونی معاملات میں مداخلت سے پرہیز مساوی طور پر ایک دوسرے کے مفادات کا تحفظ اور پرامن بقائے باہمی۔ یہ دوستی سامراج اور توسیع

"ہم آپ سے ہرگز یہ نہیں کہیں گے کہ آپ امریکہ سے تعلقات ختم کریں"

پسندوں کی جارحیت کے خلاف مشترکہ جدوجہد کے دوران میں پروان چڑھی ہے۔ یہ نہ صرف دونوں ملکوں کے عوام کے مفادات میں ہے بلکہ سامراج کے خلاف ایشیائی عوام کے جذبۂ حریت کو بھی تقویت پہنچا رہی ہے۔ تعاون اور دوستی کا یہ رشتہ دونوں ملکوں کی حکومتوں اور عوام کی جدوجہد اور کوششوں سے مستحکم ہوا ہے۔ اور ماضی کے تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ دونوں ملکوں کے عوام دوستی کے اس رشتے کا تحفظ کرنا جانتے ہیں۔ اور دنیا کی کوئی طاقت اس رشتے کو کمزور نہیں کر سکتی۔

چینی جریدہ نے پاکستان کے عوام کو زبردست خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے مزید لکھا۔

"سامراج دشمنی اور توسیع پسندوں کی مخالفت پاکستانی عوام کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ وہ اپنی قومی آزادی کو برقرار رکھنے اور بیرونی جارحیت کا دفاع کرنے کے لئے زبردست جدوجہد کر رہے ہیں۔ پاکستان کی حکومت نے اپنے آزاد خارجہ پالیسی کی بنیاد ڈالی ہے اور وہ بیرونی امور میں ایک اہم کردار ادا کر رہی ہے ترقی کی آزاد شاہراہ پر پاکستانی عوام نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں اس پر ہم انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

چین کے عوام پاکستانی عوام کی دوستی کو عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ پاکستان کی حکومت چین سے دوستی کے اٹوٹ رشتے کو ختم کرانے والے بیرونی دباؤ کا مؤثر طریقے سے دفاع کر رہی ہے۔



چین کے وزیراعظم چو این لائی صدر یحییٰ کا خیر مقدم کر رہے ہیں

پاک چین دوستی کو کوئی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی

وہ دو چین قائم کرنے والی بین الاقوامی سازش کی مخالفت کر رہی ہے اور اقوامِ متحدہ میں چین کو نمائندگی دینے کا جائز حق دلوانے کے موقف کی پوری طرح حمایت کر رہی ہے ہم پاکستان کی حکومت اور عوام کی اس حمایت پر ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں

ہمارے عظیم رہنما چیئرمین ماؤ نے کہا ہے "چینی عوام ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام کی سامراج دشمن جدوجہد کی کامیابی کو اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ اور سامراج اور نوآبادکاری نظام کے خلاف ہونے والی ہر جدوجہد کے ساتھ ہیں اور اس سے تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں"۔ چین کے عوام ماضی کی طرح اب بھی قومی آزادی اور ملکی استحکام کی حفاظت کی جدوجہد میں پاکستان کے ساتھ ہیں۔ اور کشمیری عوام کے حق خود ارادی کی مکمل حمایت کرتے ہیں۔ چین کے عوام ہمیشہ ہمیشہ پاکستانی عوام کے قابلِ اعتماد دوست اور ساتھی رہیں گے"۔

چینی جریدہ کا یہ اداریہ چین کے ستر کروڑ عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے اور اس کی حقیقت کا مظہر ہے کہ پاکستان آئندہ بھی کسی کڑے وقت میں چین پر بھروسہ کرنے میں حق بجانب ہوگا۔ صدر یحییٰ نے اس سال کے دوران میں تمام بڑے ممالک کا دورہ کیا ہے۔ روس۔ امریکہ۔ برطانیہ اور چین۔ لیکن صدر یحییٰ کے لئے صرف چین کی حکومت اور وہاں کے عوام کی جانب سے جس خلوص اور یگانگت کا مظاہرہ ہوا ہے اس نے پاکستان کے عوام کو بھی یہ توانائی پہنچائی ہے کہ چین اور پاکستان دوستی کے جس اٹوٹ رشتے میں بندھے ہوئے اسے دنیا کی کوئی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی۔



نقاش کاظمی

یہی ہے شہرِ وفا ہیں دلیلِ آمدِ شب
نظارے جاں سے گئے قتل آفتاب ہُوا
بدل گئی ہیں کتابیں سبق کچھ اور ہوئے
گرا ہے جتنا لہُو شاملِ نصاب ہُوا
بزورِ جبر و ستم شہرِ دلبراں کی قسم
جو شہر یار تھا وہ موردِ عتاب ہُوا

عجیب موسمِ گل ہے برہنہ پا ہے بہار
دلوں میں سوگ کا عالم نظر فسردہ اُداس
نکلتے دیکھے ہیں رستوں پہ اہلِ دل کے جلوس
تھکے تھکے سے قدم اور تار تار لباس
روش روش پہ سجاؤ صداقتوں کے چراغ
جگہ جگہ سے بجھاؤ چراغ حسرت و یاس

سروں کی فصل جو تیار ہے تو کیوں نہ کٹے
بہت ہے عہدِ جوانی تو کیوں ہو عمر دراز
ہمیں خبر تھی کہ سڑکیں بنیں گی مقتلِ جاں
کہ تم پڑھو گے جنازوں کی غائبانہ نماز

طریقۂ طلب انتقام یہ تو نہیں
بدلتے ہوں گے حریفوں سے جنگ کے انداز
شکستِ حوصلۂ شب زیادہ دُور نہیں
یہ کہہ رہی ہے شہیدوں کی گمشدہ آواز

صحیح ہے یہ کہ ہر اک گُل یہاں ہے جاں بلب
مگر قبائے بہاراں کو تار تار نہ کر
غریبِ صبح کے کاسہ میں کچھ اصول تو ہیں
امیرِ شب سے اجالوں کا کاروبار نہ کر
الٹ دے بڑھ کے بساطِ نظامِ کارِ جہاں
تو انقلابِ زمانہ کا انتظار نہ کر

اسلامی ممالک کے وزرائے خارجہ کی پکنک ختم ہوگئی

وقائع نویس

غیر ملکی اخبار نویس کراچی میں منعقدہ مسلم وزرائے خارجہ کانفرنس سے بہت مطمئن واپس گئے ہیں کیونکہ ان کے قیام وطعام، نقل وحرکت اور کانفرنس میں سماعت اور ترجمے کے انتظامات بہت معقول تھے۔ وہ کراچی کو پسماندہ ملک کا ایک شہر سمجھتے ہوئے ڈرتے ڈرتے آئے تھے لیکن یہاں سے بہت خوش خوش لوٹے یہ الگ بات کہ یہ کانفرنس جس مقصد اور جن دعووں کے لئے منعقد کی گئی تھی وہ نہ پورے ہوئے اور نہ اس پہلو سے لوگ مطمئن ہوئے۔

یہ کانفرنس ان لوگوں کے لئے یقیناً ناکام رہی ہوگی جنہوں نے اس سے کچھ توقعات وابستہ کی ہوں گی گذشتہ مسلم سربراہ کانفرنس (رباط) اور مسلم وزرائے خارجہ (جدّہ) کی کارروائیاں سامنے رکھنے والوں کو اس سے کوئی امید ہی نہ تھی۔ اس لئے کراچی شہر کے دانشور اور سیاسی مبصر بھی۔ اپنے شہر میں ہونے والی اس ۲۳ مسلم ملکوں کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس کے بارے میں گرمجوشی کا اظہار نہیں کر رہے تھے ورنہ عالم اسلام کے ۲۳ ممالک کے وزرائے خارجہ کا ایک جگہ جمع ہوجانا بھی بذات خود بہت بڑا تاریخی واقعہ ہے لیکن جب بات "نشستند وگفتند و برخاستند" پر ختم ہوجائے تو یہ اجتماع بھی موثر نہیں رہتا۔ کہنے والے کہہ رہے ہیں کہ اسلامی سیکرٹریٹ کے قیام کا فیصلہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ بات یوں ہوئی کہ اسلامی سیکرٹریٹ قائم ہوگا جس میں اپنی تیرہ سالہ وزارت پر لات مار کر اسلامی سیکرٹریٹ کے سیکرٹری جنرل کا عہدہ قبول کرنے والے تنکو عبدالرحمٰن اپنے سیکرٹریوں اور کلرکوں سمیت بیٹھیں گے۔ اس سیکرٹریٹ کے میز کرسیاں ٹائپ رائٹر آئیں۔ سیکرٹریٹ کی عمارت بن لے، پھر رسم افتتاح ہوگی۔ پھر فائلیں آئیں گی۔ اس میں متعلقہ ممالک اپنے اپنے مسائل لکھ کر بھیجیں گے جو اسلامی سیکرٹریٹ میں کبھی ہونے والے اجلاس میں رکھے جائیں گے پھر یہ فیصلہ ہوگا کہ ان مسائل کو اقوام متحدہ میں لے جایا جائے۔ اقوام متحدہ میں حسب معمول بحث ہوگی، ملتوی ہوگی، بحث ہوتی رہے گی پھر قرارداد پاس ہوجائے گی۔ متعلقہ ملک قرارداد پر عمل نہ کریں گے پھر مسئلہ اقوام متحدہ میں اٹھایا جائے گا، اس کے بعد پھر وزرائے خارجہ کانفرنس میں آئے گا۔ پھر اقوام متحدہ میں نئی شکل سے جائے گا یہ چکر چلتا رہے گا مسئلے وہیں کے وہیں رہیں گے، مختلف ملکوں میں وزرائے خارجہ کانفرنسیں ہوں گی۔ ملکی وغیر ملکی اخبار نویس ان کانفرنسوں میں شریک ہوتے رہیں گے۔

اسلامی ملکوں کے وزرائے خارجہ کی اس دوسری کانفرنس پر عرب ممالک میں بھی کچھ زیادہ جوش ظاہر نہیں کیا گیا، اس کانفرنس میں اگرچہ قریباً سب ممالک شریک ہوئے۔ شام نے پہلے انکار کیا تھا لیکن جب وہاں اقتدار میں تازہ تبدیلی آئی تو اس کے بعد پاکستان میں شام کے سفیر نے حکومت پاکستان سے کہا کہ شام اب شرکت کے لئے آمادہ ہوگیا ہے۔ مجھے اختیارات دیئے گئے ہیں۔ کہ میں اپنے ملک کی نمائندگی کروں۔ ایک مبصر کی حیثیت سے انہیں شرکت کی اجازت دی گئی۔ اس کانفرنس میں برطانوی لابی زیادہ سرگرم رہی۔ یہ تعجب خیز امر ہے، حالانکہ امریکہ، فرانس اور روس کی لابی بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی۔ روس اور فرانس کو زیادہ سرگرم ہونا چاہیئے تھا۔ ممکن ہے کہ اسلامی ملکوں میں امریکہ دشمن جذبات کے پیش نظر امریکہ نے اپنے مفادات کی نگرانی برطانوی لابی کے سپرد کردی ہو اب اسلامی سیکرٹریٹ میں تنکو عبدالرحمٰن کی موجودگی اسلامی ملکوں میں برطانوی نوآبادیاتی نظام کے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا

برطانوی لابی کو ہم پاک بھارت سیاست کے پیش منظر میں رکھ کر بھارتی لابی بھی کہہ سکتے ہیں ملائیشیا اب نئے انڈونیشیا اور کچھ عرب ممالک کے بھارت کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ملائیشیا نے بھارت کی جارحیت کے دوران جس طرح ظالم بھارت کا ساتھ دیا، وہ ہماری نظروں میں ہے اس کانفرنس کے انتظامات پاکستان سے نوابزادہ شیر علی خاں نے کئے تھے جو انڈونیشیا میں سفیر رہ چکے ہیں۔ کانفرنس کے سلسلے میں وہ بار بار کوالالمپور بھی گئے کانفرنس کے ایجنڈے میں مسئلہ کشمیر شامل نہ کرنے پر پاکستان کے چند اخبارات اور آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم خان نے احتجاج کیا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ وزرائے خارجہ کانفرنس منعقدہ جدّہ میں جب اگلی کانفرنس کے لئے شہر کا انتخاب ہو رہا تھا تو اسی میں نواب زادہ شیر علی خاں پاکستان وفد کے قائد نے یقین دلایا تھا کہ پاکستان اپنا کوئی مسئلہ کشمیر کے تنازعے سمیت اس کانفرنس میں پیش نہ کرے گا کیونکہ

بھارتی لابی کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا یہ معمولی بات نہیں ہے۔ اسلامی ملکوں میں ایک غیر مسلم ملک اور سب سے بڑی اسلامی مملکت کے دشمن کی لابی اتنی مضبوط ہے کہ وہ کانفرنسوں میں شامل نہ ہونے کے باوجود اتنا اثر رکھتا ہے کہ سب سے بڑی اسلامی مملکت کے سینے پر یہ کانفرنس منعقد ہو، اور وہ اس کے باوجود اپنے دل کے پھپھولے نہ ظاہر کرسکے۔ پچاس لاکھ کشمیری بھارت کے تسلط میں موت سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں، حق خود اختیاری سے محروم ہیں، لیکن ان کا مسئلہ دنیا کے مسلمانوں کی نمائندہ کانفرنس میں اس لئے نہیں اٹھایا جاسکتا کہ پاکستان ایک میزبان ملک ہے سوال یہ

مسئلہ کشمیر کانفرنس میں پیش نہ کرنے کی یقین دہانی شیر علی نے کرائی تھی

ہے کہ مسئلہ کشمیر پاکستان کا مسئلہ نہیں ہے پچاس لاکھ مسلمانوں اور انسانوں کا مسئلہ ہے۔ جو حیات و موت کی کش مکش میں مبتلا ہیں۔ جو کانفرنس پچاس لاکھ بھائیوں کے کرب کا احساس نہیں کر سکتی، اس سے کن مسائل کے حل کی توقع کی جا سکتی ہے کیا یہ کانفرنس انٹر کانٹی نینٹل کے ایر کنڈیشنڈ آرام دہ کمروں میں ٹھہرنے، کراچی کے بازاروں میں شاپنگ کرنے کے لئے منعقد کی گئی تھی۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ آزاد کشمیر ایک خود مختار مسلم مملکت ہے تو اس کے سربراہ کو اس کانفرنس میں ایک مبصر کی حیثیت سے بھی شریک کیوں نہیں ہونے دیا گیا۔ یہ مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کیا جا سکتا ہے تو وزرائے خارجہ کانفرنس میں اس پر کیوں غور نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان کی میزبانی کا سوال نہیں تھا۔ تاشقند کی اسپرٹ کا خیال رکھتے ہوئے اس مسئلے کو اس کانفرنس میں پیش نہیں کیا گیا۔ اب لوگوں پر تاشقند کے معاہدے کی شرط واضح ہو جانی چاہیئے۔ جس کے بعد پاکستان اب کہیں کشمیر کو ایک تنازعے کے طور پر بھی پیش نہیں کر سکتا۔ آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم خان نے بجا طور پر کہا ہے کہ کشمیری حکومت پاکستان کے معاہدوں کے پابند نہیں ہیں انہیں چاہیئے تھا کہ اس کانفرنس میں آزاد کشمیر کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کا تقاضا کرتے، ایک اور حادثہ یہ بھی ہوا کہ پہلے مشترکہ اعلامیوں میں قوموں کے حق خود اختیاری کا ذکر ہو جایا کرتا تھا۔ اب کے یہ بھی نہ ہوا۔ عملاً اس سے گریز کیا گیا کیونکہ اس سے خطرہ تھا کہ بات کشمیریوں تک جا پہنچے گی اور تاشقند کی روح کو صدمہ پہنچے گا۔

فرخا براج کا مسئلہ بھی اس کانفرنس میں کوئی اہمیت نہ پا سکا۔ یہ تو اپنے مسائل کی بات تھی باقی مسئلے دوسرے مسلم ممالک کے تھے ان میں سے قبرص کا مسئلہ بھی بازیابی نہ پا سکا یہ مسائل پاکستان اور ترکی نے اٹھائے نہ کسی دوسرے دوست ملک کو ہی توفیق ہوئی کہ یہ بات کرتا۔

مشرق وسطیٰ کے مسئلے پر بھی مسلم وزرائے خارجہ کے لہجے میں بہت نرمی آگئی ہے جدہ کانفرنس میں جس جوش و خروش، اور مجاہدانہ کردار کا مظاہرہ کیا گیا تھا وہ کراچی میں نہیں تھا۔ اس دوران میں صدر ناصر کا انتقال شام میں حکومت کی تبدیلی بھی قابل غور رہی جدہ میں اسرائیلی جارحیت کی سختی سے مذمت کی گئی تھی۔ اب کے اسرائیل سے صرف مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ مقبوضہ علاقوں سے اپنے فوجی دستے نکال لے۔ اسرائیل کے سلسلے میں ظاہر ہوا کہ عرب ممالک کا رویہ بہت نرم ہو گیا ہے۔ ایک یہ کانفرنس اور دو وزرائے خارجہ کانفرنسوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اور اسے مسلم دنیا کے "سیاسی مبصرین" حقیقت پسندانہ رویہ قرار دے رہے ہیں۔ یہ ۲۳ مسلم ممالک کا ایک ۲۴ لاکھ کی آبادی کے چھوٹے سے یہودی ملک اسرائیل سے خوف کا عالم ہے۔ یہ ۲۳ کانفرنسیں بلانے کے بعد بھی اپنے موقف کا کھل کر اظہار نہیں کر سکتے۔ وہ اکیلا اپنے موقف پر ڈٹا ہوا ہے اور ان سب کی مشترکہ کوششوں کا جواب دے رہا ہے۔

غریب اور پسماندہ افریقی ممالک اپنے مسائل اور جذبات کے اظہار میں نسبتاً بے باک رہے۔ اور انہوں نے اپنے آپ پر ٹوٹنے والے مسائل کا خوب کھل کر ذکر کیا کانفرنس سے مثبت اقدامات کا مطالبہ کیا۔ یہ ایسے ممالک تھے جن کے وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں، آبادی بہت کم ہے۔ ان کے مقابلے میں زیادہ دولت زیادہ آبادی اور زیادہ وسائل والے ممالک اپنے مسائل پر بہت ڈر ڈر کر بولے۔ بات یہ تھی کہ بڑے اسلامی ملکوں سے اس کانفرنس کو ایک تفریح اور ایک مل بیٹھنے کی رسم خیال کیا۔ گھومے پھرے، پاکستان میں مصنوعات کی خریداری کی اور چلے گئے غیر ملکی اخبار نویسوں کا بھی یہی تاثر تھا کہ بڑے اسلامی ملکوں کے وفد سنجیدہ نہیں ہیں۔ اور اسے ایک پکنک خیال کر رہے ہیں۔ اس کا ثبوت دوسری بڑی اسلامی مملکت یا بقول خود سب سے بڑی اسلامی مملکت انڈونیشیا کے وزیر خارجہ ڈاکٹر آدم ملک کانفرنس کے آخری اور فیصلہ کن اجلاس سے قبل بارہ بجے کے قریب ہی وطن کو واپسی تھی۔ انہوں نے آخری اجلاس میں شرکت بھی ضروری نہ سمجھی جس میں مشترکہ اعلامیہ تیار کیا جا رہا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ان کے ملک میں کابینہ کا اجلاس ہونے والا ہے اس لئے جانا ضروری ہے۔ یہ کوئی معقول عذر نہ تھا کیونکہ یہاں ۲۳۔ اسلامی ملکوں کے وزرائے خارجہ موجود تھے ان کے اجلاس سے انڈونیشی کابینہ کا اجلاس قطعاً ضروری نہ تھا۔ بہر حال انٹر کانٹی نینٹل کے سوئمنگ پول، بیچ لگژری کے لان، اسٹیٹ بنک کے مرمریں ہال، نرسری اور الفلاح کی دکانوں پر ہونے والی یہ پکنک بخیر و خوبی انجام پائی۔ وزرائے خارجہ اپنے ملکوں کو اور شہر کو گھیرے میں لینے والے سپاہی اپنے اپنے علاقوں کو لوٹ گئے۔

نادہندہ ایجنٹ حضرات توجہ فرمائیں

ادارۂ **الفتح** انتہائی افسوس کے ساتھ یہ اعلان کرنے پر مجبور ہے کہ بعض ایجنٹ حضرات نے متعدد بار یاد دہانیوں کے باوجود واجبات ادا نہیں کیے۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ادارہ نے ایسے ایجنٹوں سے بھرپور تعاون کیا اور کئی مہینوں تک خط و کتابت کے ذریعے معاملہ طے کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود جہاں ہمیں اکثریت کا عملی تعاون حاصل رہا وہاں کچھ ایسے ایجنٹ موجود رہے جن کے بارے میں اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ۱۲ جنوری ۱۹۷۱ء تک ادائیگی نہ کی گئی تو آئندہ اشاعت میں ان کے نام شائع کر دیے جائیں گے۔

ہم یہ سطور لکھتے ہوئے اپنے کرم فرما ایجنٹ حضرات کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے الفتح کو مقبول بنانے میں بھرپور تعاون کا مظاہرہ کیا۔

(جنرل مینجر)



۷۱ اُمّیدوں کا سال ہے



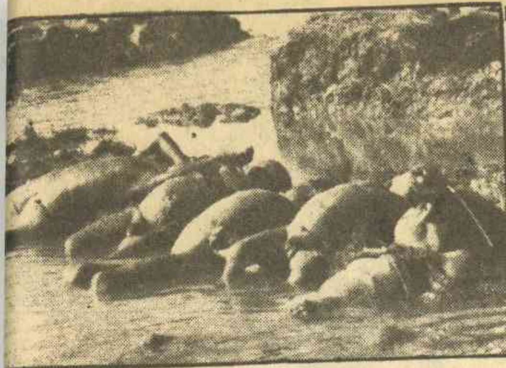
اشرف شاد

سنہ ۱۹۷۰ء تاریخ کے عجائب گھر میں سجایا جاچکا ہے لیکن جاتے جاتے اس نے ہوا کے کچھ تازہ جھونکے فضا میں چھوڑے ہیں۔ جن سے ذہنوں کو قدرے کشادگی کا احساس میسر آیا ہے۔ اس اعتبار سے ۱۹۷۰ء یقیناً ایک اہم سال ثابت ہوا ہے کہ رجعت پسندوں نے پورے ملک میں گھٹن کی جو فضا پھیلائی تھی وہ سمٹ کر کسی تاریک کونے میں جاچکی ہے۔ لیکن ذہنوں کی یہ کشادگی بڑی حد تک دانشوروں اور متوسط طبقے کے ان ترقی پسندوں کا مسئلہ ہے جن میں سے بہت سے لوگوں کی نبضیں ۳۱ مئی ۱۹۷۰ء کے یومِ شوکتِ اسلام کو دیکھ کر سست پڑ گئی تھیں۔ ان کا یہ مسئلہ ۱۹۷۰ء نے حل کر دیا ہے۔ وہ اب ایئر کنڈیشنڈ کافی ہاؤسوں، چائے خانوں، اپنے گھر کے سجے ہوئے ڈرائنگ روموں یا نئے سال کی تقریبات اور ولیمہ کی دعوتوں میں سینہ تان کر اپنے سوشلسٹ اور عظیم الشان کامیابی حاصل کرنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ اور مخالفین کو بغلیں جھانکتا دیکھ کر محظوظ بھی ہو سکتے ہیں۔

لیکن متوسط طبقے کے ان کھاتے پیتے دانشوروں اور بابو لوگوں کی ذہنی کشادگی کے علاوہ اس ملک میں ان مزدور کسان طبقوں کے بھی کچھ مسائل ہیں جنہیں سالوں کی آمد یا روانگی کی اطلاع تک نہیں ہوتی۔ جو کسی سال کی تخصیص کئے بغیر ہر سورج کو بڑی خاموشی سے طلوع ہوتا دیکھتے ہیں اور اپنے جسم پر استحصال کے بے رحم پنجوں سے نئے کھرونچے لگوا کر بڑی بے چارگی سے اسے خدا حافظ کہہ دیتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کیا ان کے لئے بھی نیا سال بن کر آیا ہے۔! کیا نئے سال کی یہ آمد ان کے لئے بھی کوئی تبدیلی لے کر آئی ہے۔! ان کے سوالوں کے جواب میں ان کے دامن کو ٹٹولتے وقت ہمیں چند دھجیوں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

ہمارے ملک کے مزدوروں اور کسانوں نے ابھی تک صرف ایک سال دیکھا ہے وہ استحصال کا سال ہے۔ جس کے مہینے ظلم و تشدد اور جبر و استبداد سے عبارت ہیں جس کے شب و روز بھوک اور مفلسی کی چادر تانے کھڑے ہیں اور جس کی ہر گھڑی محنت کو تجوریوں میں بند کرنے کے عمل کا نام ہے۔ استحصال کا یہ سال ۲۳ برس پہلے شروع ہوا تھا اور جب سے محنت کرنے والے مزدور اور کسان سال کی اس زنجیر کی کڑیاں گن رہے ہیں۔ یہ کڑیاں کبھی کبھی جھنکار دیتی ہیں۔ تو استحصال کے اس سال کا سورج مغرب کی طرف ڈوبنے لگتا ہے۔ لیکن پھر اپنے نصف النہار پر پہنچ جاتا ہے۔

استحصال کا یہ سال کب غروب ہوگا۔ بیسویں صدی کی کون سی دہائی ۲۳ برس میں پیدا ہونے والے ۲۳ اجارہ دار خاندانوں کے لئے احتساب کی تلوار لے کر آئے گی۔ مزدور کسان پیداوار میں اپنا حصہ بٹانے کے حقدار کب بنیں گے ———؟ یہ سوالات جواب کے لئے جدوجہد کی اس راہ کو تک رہے ہیں جس سے کچھ سر پھروں کے قدموں کی آواز آرہی ہے جس پر ایک ہلکی گرد سی اڑتی دکھائی دے رہی ہے اور جس وقت بھی یہ آواز ایک گونج بنی اور گرد کی تہہ سے سر پھروں کی وہ فوج برآمد ہوئی جو انقلاب کی منزل تک پہنچنے کے لئے بندوق کی نالی سے گزرنا جانتی ہے تو استحصال کی عمارتوں کو زمین بوس ہونے میں کچھ دیر نہیں لگے گی۔



سنہ ۱۹۷۰ تباہی کا سال تھا

۱۹۷۱ء ہر سال کی طرح شہر کی رقص گاہوں میں بیلے اور بال روم قسم کے ناچوں کے دوران میں ۱۲ بج کر ایک منٹ پر بتیاں بند ہونے سے شروع ہوا "ہیپی نیو ایئر" کی جھنکار بھی گونجیں۔ لیکن ۱۹۷۱ء کے طلوع ہونے والے پہلے سورج نے بھی منگھو پیر اور لانڈھی کے صنعتی علاقوں کے ملوں کے بند دروازوں پر بھرتی کے لئے آنے والوں کا وہی ہجوم دیکھا جو وہ سال کے ۳۶۵ دنوں میں دیکھتا رہا تھا۔ اس سال صورت حال میں معمولی سی تبدیلی آئی تھی۔ یہ نیا سال ان لوگوں کے لئے وعدوں اور آرزوؤں کا سال بن کر آیا۔ صنعتوں اور زمینوں میں حصہ دار بنانے کے وعدوں کا سال۔ اس اعتبار سے نئے سال کا یہ سورج پہلی مرتبہ روشنی کی ایک کرن بنا کہ سوشلزم کا نام لینے والے اسمبلیوں میں جا پہنچے ہیں۔ امید کی اس کرن کا کیا بنے گا، مزدور کیا پائے گا اور کسان کو کیا کچھ ملے گا۔ آنے والے چند ماہ اس کا جواب بن کر سامنے آجائیں گے۔

۱۹۷۰ء نے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بڑی دور رس تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ یہ ایک اہم سال تھا جس کے وسطی حصے نے بہت سی آفتوں کا منہ دیکھا۔ لیکن جس کے آخری مہینے میں سیاست کی پورٹر والا بساط پر سارے رجعت پسند مہرے پٹ گئے۔ ۱۹۷۰ء کی ابتدا صدر یحییٰ نے یکم جنوری کو کاکس بازار کے راڈار اسٹیشن کا افتتاح کرکے کی تھی۔ لیکن ۱۲ نومبر کو اسی راڈار اسٹیشن کی سنگین اور مجرمانہ لاپرواہی اور غیر ذمہ داری اس قدر تباہ کن بن گئی کہ آدھا مشرقی پاکستان قیامت صغریٰ کا منظر پیش کرنے لگا۔ اس طوفان میں ایک اندازے کے مطابق تقریباً پندرہ بیس لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔ یہ اس سال کا سب سے ہولناک تحفہ تھا جس نے نہ صرف پورے ملک بلکہ دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مشرقی پاکستان میں یہ اس سال کی تیسری تباہی تھی۔ اس اعتبار سے پاکستان کے لئے یہ سال تباہی کا سال تھا۔

"یہ سال رجعت پسندوں کا سال ہے" ۱۹۷۰ء کے بارے میں یہ نظریہ کراچی کے ایک بہت بڑے دانشور کا تھا۔ یوم شوکت اسلام، اخبارات پر پسند حسن کا قبضہ "نوابزادہ شیر علی خاں"، بائیں بازو کے لیڈروں کی گرفتاریاں، صحافیوں کی برطرفی، فتوٰی بازی، کفر سازی، بینروں اور رنگین کتابچوں کے طوفان اور اجارہ داروں کی سرمایہ کاری ان سب نے اس سال کو بڑی حد تک رجعت پسندوں کا سال بھی بنا دیا تھا۔ شیر علی خاں نے پوری حکومت کی غیر جانبداری کو متاثر کر دیا تھا۔ کراچی، لاہور، راولپنڈی اور دوسری جگہوں سے سینکڑوں صحافیوں کو ایک سازش کے تحت نوکریوں سے محروم کر دیا گیا تھا نیشنل پریس ٹرسٹ سازشوں کا گہوارہ اور اسلام پسندوں کے مفادات کا "سول ایجنٹ" بن گیا تھا۔ ریڈیو میں آزاد خیال دانشوروں کا داخلہ ممنوع تھا۔ ٹی وی پر بھی یہی صورت حال تھی۔ طارق عزیز پر مزدور کسانوں کی بات کرنے کے جرم میں ٹی وی پروگراموں میں حصہ لینے کی پابندی لگا دی گئی تھی۔ جبکہ بہاولپور صوبہ تحریک کی طاہرہ مسعود سیاست میں پوری طرح ملوث ہونے کے باوجود ٹی وی پر اپنے حسن کی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ محض اس لئے اداکاری کے کرتب دکھاتے کے لئے آزاد تھیں کہ اسلام پسندی ان کا مسلک تھی۔

کوثر نیازی صاحب کو قرآن کی تفسیر بیان کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ ماضی کے بڑے بڑے دانشور جسارت اور زندگی میں غزلیں نظمیں چھپوا کر اپنی خطائیں بخشوا رہے تھے اور کچھ آزاد خیال جریدوں سے اپنے نام ہٹوا کر خود کو بے قصور ثابت کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اس تمام صورت حال نے اس سال کو دانشور موصوف کے بقول واقعی رجعت پسندوں کا سال بنا دیا تھا۔

یہ سال ہڑتالوں، گرفتاریوں اور بے روزگاریوں کا سال بھی تھا۔ اس سال داؤد کی تاریخی ہڑتال ہوئی۔ مزدوروں کو داؤد کی خود ساختہ جیلوں میں محبوس کرکے مارا نہیں گیا۔ ان کے سینوں میں گولیاں اتاری گئیں آنسو گیس کے پردے ان کی آنکھوں پر تانے گئے اور ان کے سروں پر لاٹھیوں سے سنگت کی گئی۔ ان کے علاوہ پوری ملک انڈسٹری، دواؤں کی مختلف فیکٹریوں، ٹیکسٹائل کے کارخانوں، گودی کے مزدوروں، لاری گروپ کے انڈس کیمیکلز، آئل ٹینکروں اور دوسری متعدد جگہوں پر ہڑتالیں ہوئیں۔ لاٹھیوں، گولیوں، آنسو گیس، جیلوں، کوڑوں اور برطرفیوں کی روایتیں ہر جگہ دہرائی گئیں۔ ایک بڑا المیہ صحافیوں کی ہڑتال تھی جس میں ایسے تمام صحافی ملازمتوں سے محروم کر دیئے گئے جو جدوجہد کرنے والے مزدوروں کی خبریں کسی نہ کسی طرح اخبار میں چھپوا دیا کرتے تھے۔ اساتذہ نے بھی کئی موقعوں پر ہڑتالیں کیں اور رجعت پسندوں کی تمام تر سازشوں اور کارروائیوں کے باوجود اپنی جدوجہد کو جاری رکھا۔ فلمی دنیا نے بھی اس سال ایک طویل ہڑتال کی اور فلمی میدان میں نوابزادہ شیر علی خاں کی حرکتوں کے خلاف صدائے احتجاج

باقی صفحہ ۳۲ پر

مزدور اور کسان استحصال کے سال کی کڑیاں گن رہے ہیں



اسلام کا نام استعمال کر کے سی آئی اے نے چند ماہ میں وہ کام کر لیا جو اٹھارہ سال سے اس کے لئے ایک چیلنج بن کر رہ گیا تھا

سوئیکارنو پر قاتلانہ حملے میں کالٹیکس نے حصّہ لیا تھا

سید محمد سلیمان

انڈونیشیا کے اعلان آزادی کے روز ہی سے امریکی سی آئی اے نے صدر سوئیکارنو کے خلاف سازشوں کا جال پھیلا دیا تھا۔ لیکن صدر سوئیکارنو امریکی سامراج کے لئے ترنوالہ ثابت نہیں ہوئے بلکہ ان کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لئے سی آئی اے نے مسلسل اٹھارہ سال عملی طور پر سازشیں کیں اور بالآخر ۱۹۶۵ء میں وہ "تحفظ اسلام" کے نام پر اپنی اس مذموم سازش میں کامیاب ہوئی۔

ایک طویل دورِ غلامی سے جدو جہد پیہم کے بعد نجات حاصل کرنے کے دور (۱۹۴۹ء) سے لے کر (۱۹۵۷ء) تک انڈونیشیا میں برطانوی طرز کی پارلیمانی حکومت رہی۔ لیکن یہ تجربہ انڈونیشیا میں کامیاب نہ ہو سکا، لہذا ۱۹۵۷ء میں صدر سوئیکارنو یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ ہزاروں جزیروں پر مشتمل یہ ملک اس طرزِ جمہوریت کے ہاتھوں بے حد و بے حساب نقصان اٹھا چکا ہے اب اس پر مزید عمل پیرا ہونے کا یہ مطلب ہوگا کہ سیاسی طور پر ملک کو تباہی کے عمیق غار میں دھکیل دیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ طرزِ حکومت میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ ملک کے معاشی ڈھانچے میں بھی بنیادی تبدیلیوں کی اشد ضرورت ہے۔

حالانکہ اس وقت تک انڈونیشیا کو آزاد ہوئے آٹھ سال کا عرصہ گذر چکا تھا لیکن اس وقت تک انڈونیشیا کے کچھ علاقے ڈچ سامراج کے قبضے میں تھے جن کو آزاد کرانے کے لئے نیوگنی کے علاقے میں زبردست جنگ جاری تھی۔ اس وقت انڈونیشیا کو بھاری اسلحے کی اشد ضرورت تھی۔ لیکن اس سلسلے میں کوئی بھی مغربی ملک انڈونیشیا کی مدد کرنے پر رضامند نہیں تھا۔ اس کڑے وقت میں جبکہ یہ انڈونیشیا کے لئے زندگی اور موت کا سوال تھا روس نے آگے بڑھ کر سوئیکارنو کی بھرپور امداد کی۔

اس کے تھوڑے عرصے بعد ہی صدر سوئیکارنو نے نہ صرف اپنی نئی پالیسی پر عمل درآمد شروع کیا بلکہ صدارتی نظامِ حکومت کے ساتھ ساتھ ملکی نظامِ معیشت کے ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیوں کے لئے، عوام کو سرمایہ دارانہ استحصالی نظام کے جوئے سے آزاد کرانے کے لئے اور ملکی معیشت کو سوشلسٹ خطوط پر تربیت دینے کے لئے انہوں نے اپنی کابینہ میں بائیں بازو کے عناصر کو ترجیح دی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے خارجہ پالیسی بھی تبدیل کی اور روس اور چین سے تعلقات بڑھانے شروع کئے۔

امریکی صدر آئزن ہاور نے صدر سوئیکارنو کے اس رجحان کو تشویش کی نظروں سے دیکھا کیونکہ ان کو خطرہ تھا کہ کہیں انڈونیشیا مکمل طور پر سوشلسٹ بلاک میں شامل نہ ہو جائے۔ واضح رہے کہ یہ سرد جنگ کا بدترین دور تھا۔ امریکہ کو یہ خدشہ تھا کہ اگر ایسا ہو گیا تو سوشلسٹ ممالک انڈونیشیا کے قدرتی وسائل سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ انڈونیشیا میں ربڑ، ٹین اور تیل وافر مقدار میں پیدا ہوتا ہے۔ جس سے اب تک مغربی ممالک ہی فائدہ اٹھا رہے تھے۔ علاوہ ازیں برِاعظم ایشیا اور آسٹریلیا کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے بھی اس کی مواصلاتی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ جس کو امریکہ نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔

انہی وجوہات کی بناء پر امریکی حکومت نے فیصلہ کیا کہ صدر سوئیکارنو کی مخالفت میں انڈونیشیا کے عوام کو ابھارا جائے اور ان کے خلاف ایک محاذ قائم کیا جائے تاکہ کسی امریکہ نواز شخص کو حکومت کی باگ ڈور سونپی جا سکے جو امریکہ کے تمام تر مفادات کی نگہداشت کر سکے۔ چنانچہ غور و خوض کے بعد اس فیصلے پر عمل کیا گیا۔

۳۰ نومبر ۱۹۵۷ء کو جب صدر سوئیکارنو چکنی گریڈ اسکول میں تقریر کر رہے تھے تو انڈونیشیا کے ایک باشندے نے جو سی آئی اے کا ایجنٹ تھا ان پر قاتلانہ حملہ کیا۔ اس حملے کے متعلق اس نے اپنے ایک مضمون میں لکھا!

"میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں اور خوف و اضطراب سے میرے اعصاب جواب دیتے جا رہے تھے۔ میں نے بارش کی اوٹ سے صدر کی ٹوپی دیکھی اور پھر میں نے دستی بم پھینک مارا۔ مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ بہت سے لوگ زمین پر گر پڑے ہیں اور تڑپ رہے ہیں۔ اور پھر میں نے فوراً ہی دوسرا دستی بم بھی پھینک دیا ......"

اس حملے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرانس کے مشہور صحافی پیری ویدل نے اپنے مضامین کے طویل سلسلے میں، جن میں اس نے سی آئی اے کی مذموم زمانہ سرگرمیوں کا کچا چٹھا کھولا ہے، یہ لکھا۔

"یہ حملہ جس میں صدر سوئیکارنو موت کے منہ میں جا کر واپس آئے۔ سی آئی اے کے ایجنٹوں کا کام تھا۔ اس حملے میں یو ایس آئی ایس اور بعض دوسری نجی امریکی کمپنیوں نے سی آئی اے کی ہر طرح سے امداد کی۔ یہ امریکی کمپنیاں صدر سوئیکارنو کی غیر ملکی سرمایہ کاری سے متعلق نئی اور آزادانہ پالیسی کے سخت خلاف تھیں کیونکہ اس

انڈونیشیا میں پارلیمانی طرزِ حکومت کا تجربہ ناکام رہا

پالیسی سے ان کے مفادات مجروح ہوتے تھے۔ اس حملے میں نمایاں کردار کالٹیکس اور اسٹانویک نے ادا کیا۔ بعد کی اطلاعات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پڈانگ میں امریکی شعبۂ اطلاعات کے دفتر نے اس اسکیم کی تیاری کے سلسلے میں ہیڈکوارٹر کا کام دیا تھا۔ اور یہیں پر تمام تر سازش تیار کی گئی تھی۔"

"۹ جون کو کرنل لوبس اور اس کے امریکی شریکِ کار نے ستمبرا میں ایک خود مختار حکومت کے قیام کے بارے میں پروگرام مرتب کیا۔ ان مذاکرات میں امریکی شعبۂ اطلاعات کا ایک عہدہ دار والٹر جارجز اس بھی شریک تھا۔ اس کے علاوہ کالٹکس کا ایک نمائندہ اور سنگاپور سے آیا ہوا سی آئی اے کا ایک ایجنٹ بھی ان ملاقاتوں میں شریک رہے۔"

کرنل لوبس کی جانب سے پیش کئے جانیوالے امریکی مطالبات کا مطالعہ نہایت دلچسپ ہے۔ ان مطالبات میں انڈونیشیا کے فوجی اڈوں اور تیل کے کنوؤں پر امریکہ کو مساوی حق ملنا اور غیر ملکی سرمایہ کاری سے متعلق ایک مبینہ پالیسی پر عمل پیرا ہونا شامل تھا۔ امریکہ نے ان من مانی شرائط پر باغیوں کی امداد کا وعدہ کر لیا اور ان کو اسلحے کی ترسیل شروع کر دی۔"

چنانچہ پروگرام کے مطابق ۱۸ فروری ۱۹۵۰ء کو ڈاکٹر صفرالدین نے جزیرہ سماٹرا کے صدر مقام پڈانگ میں ایک انقلابی کونسل کے قیام کا اعلان کر کے ایک مخلوط حکومت قائم کر لی۔

صدر سوئیکارنو نے فوری طور پر باغیوں کی سرکوبی کے لئے احکامات جاری کئے۔ اور جنرل ناسوشن نے فوری طور پر جوابی کارروائی کر کے باغیوں کا قلع قمع کر دیا۔ ان اعلیٰ افسران کو فوج سے ڈسچارج کر دیا گیا جو باغیوں سے مل گئے تھے۔ ان کی تعداد چھ تھی اس کے علاوہ باغیوں کے ریڈیو اسٹیشنوں پر بھی کامیاب فضائی حملے کئے گئے اور اس طرح ان کے چھ میں سے دو ریڈیو اسٹیشن ہمیشہ کے لئے خاموش کر دئیے گئے۔ میدانِ جنگ میں ہزیمت اٹھانے کے بعد انقلابی کونسل نے ایک اخباری بیان میں، جس کو امریکی خبر رساں ایجنسی نے دنیا میں پھیلایا، امریکہ سے فوجی امداد کی فراہمی اور انقلابی کونسل کو انڈونیشیا کی قانونی حکومت تسلیم کئے جانے کی درخواست کی۔ لیکن عالمی رائے عامہ کے دباؤ کے تحت امریکہ کھلے بندوں ایسا نہ کر سکا۔ اور دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے امریکہ نے اعلان کیا کہ انڈونیشیا کا معاملہ ایک ملک کا داخلی مسئلہ ہے لہٰذا امریکہ اس میں قطعاً دخل اندازی نہیں کرے گا۔

ایک طرف تو امریکہ کے وزیر خارجہ جان فوسٹر ڈلس

شدید ترین خطرات میں گھرے ہونے کے باوجود سوئیکارنو کو اپنی حفاظت کی فکر نہیں تھی

نے انڈونیشیا کے داخلی امور میں دخل اندازی نہ کرنے کا اعادہ کیا تھا لیکن دوسری طرف انقلابی کونسل کی امداد شروع کر دی تھی۔ امریکہ کے طیارے اور ہواباز براہ راست انڈونیشیا پر بمباری شروع کر چکے تھے۔ امریکہ سے امداد ملنے پر باغیوں نے سماٹرا میں اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔ لیکن یہاں بھی جنرل ناسوشن نے ان کے چھکے چھڑا دیئے اور بارہ گھنٹے کی جوابی کارروائی کے بعد شہر کو باغیوں سے آزاد کرا لیا۔

اس موقع پر صدر سوئیکارنو مجبور ہو گئے کہ وہ امریکہ کے مکروہ چہرے سے شرافت کا نقاب پلٹ دیں۔ چنانچہ انہوں نے امریکہ کی دوغلی پالیسی کی قلعی کھولتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ انڈونیشیا کے اندرونی امور میں دخل اندازی کر کے تیسری جنگِ عظیم کو ہوا دے رہا ہے۔ انہوں نے اشارتاً یہ بھی کہا کہ اگر وہ چاہیں تو محض آنکھ کے اشارے سے لاکھوں بیرونی رضاکار بلوا سکتے ہیں۔ غالباً ان کا اشارہ چین کی طرف تھا۔ اس موقع پر امریکی صدر نے بنفسِ نفیس اس الزام کی تردید کی۔ صدر آئزن ہاور نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ کا مؤقف ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ وہ کسی دوسرے ملک کے اندرونی معاملات میں ہرگز دخل اندازی نہیں کرے گا۔ صدر آئزن ہاور نے مزید زور دیتے ہوئے کہا کہ خصوصاً انڈونیشیا کے معاملات میں تو امریکہ مکمل طور پر لاتعلق ہے۔ لیکن صدر آئزن ہاور کی یہ کذب بیانی چند روز بعد ہی کھل گئی۔ اس واضح اور غیر مبہم اعلان کے چند روز بعد ہی یہ ثابت ہو گیا کہ غیر جانبداری کا یہ مؤقف محض لفاظی اور حسین فریب ہے۔ ۲۷ مئی کو حکومت انڈونیشیا نے ڈرامائی طور پر یہ اعلان کیا کہ اس کے پاس اس امر کے ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہیں کہ امریکہ باغیوں کی فوجی امداد کر رہا ہے۔ اعلان میں مزید کہا گیا تھا کہ انڈونیشیا کی زمینی طیارہ شکن توپوں نے ایک امریکی ہواباز ایلن لارنس پوپ کے طیارے کو مار گرایا ہے۔ اور ہواباز کو زخمی حالت میں گرفتار کر لیا ہے۔ اعلان میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ یہ ہواباز انڈونیشیا کے پُرامن شہریوں پر بمباری کر رہا تھا۔

اس اعلان کے فوراً بعد جکارتہ میں متعین امریکی سفیر نے فوراً یہ بیان جاری کیا کہ ایلن لارنس پوپ کا امریکی حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ محض دولت کی خاطر باغیوں سے جا ملا ہوگا۔ امریکی سفیر نے اس کو "کرائے کے فوجی" کا لقب دیا۔ لیکن اس اعلان سے نہ تو حالات ہی درست ہوئے اور نہ ہی انڈونیشیا کی حکومت نے اس عذر لنگ کو قبول کیا۔ بین الاقوامی میدان میں بھی اس مؤقف کی صحت پر برملا اظہارِ شک کیا گیا۔

سوئیکارنو کے خلاف سازش امریکی شعبہ اطلاعات نے تیار کی تھی

اب حالات بہت بگڑ چکے تھے چنانچہ انڈونیشیا کی حکومت کو رام کرنے کی غرض سے امریکی حکومت نے فوری طور پر ۳۷ ہزار ٹن چاول کا عطیہ دینے کا اعلان کیا۔ اس کے علاوہ دس لاکھ ڈالر کا سامان جنگ بھی فوری طور پر انڈونیشیا روانہ کر دیا گیا۔ لیکن دریا دلی کا یہ مظاہرہ امریکہ کے مقصد کے حصول میں معاون ثابت نہ ہوسکا۔ اور امریکہ کی تمام تر کوششوں کے باوجود کہ پوپ کو امریکی حکومت کے حوالے کر دیا جائے اس کو ۲۸ دسمبر کو فوجی عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ اس پر باغیوں کی مدد کرتے انڈونیشیا کے پرامن شہریوں پر بمباری کرکے ان کو ہلاک کرنے کا الزام تھا۔ مقدمے نے طول کھینچا۔ فوجی عدالت نے شب و روز سماعتیں کیں اور بالآخر ۲۹ اپریل ۱۹۶۰ء کو فوجی عدالت نے جرم ثابت ہونے پر اس کو سزائے موت کا حکم سنا دیا۔

اس فیصلے کے خلاف پوپ نے ملٹری سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی، اس کے علاوہ اس کی بیوی نے بھی صدر سوئیکارنو سے ذاتی طور پر رحم کی درخواست کی۔ لیکن اس کی درخواست رد کر دی گئی۔

امریکی حکومت نے فیصلہ کر لیا تھا کہ پوپ کو ہر قیمت پر آزاد کرائے گی۔ اس سلسلے میں اس نے دو محاذوں پر سرگرمی دکھائی۔ پہلا سفارتی میدان تھا اور دوسرا سازشی محاذ۔ اور یہ سی آئی اے کی ذمہ داری تھی کہ وہ سازشی محاذ پر سرگرم عمل ہو جائے۔ سی آئی اے نے بھی یہ سوچ لیا تھا کہ ہر جائز و ناجائز طریقہ بروئے کار لاکر پوپ کو آزاد کرائے گی۔ لیکن ابھی تک اس کو اس مقصد کے حصول میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ سی آئی اے نے ناجائز طریقوں پر عمل کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے انڈونیشیا میں مصروف کار ایجنٹوں کو ہدایات جاری کر دیں کہ وہ پوپ کو رہا کرانے کے سلسلے میں ہر قدم اٹھانے کے لئے آزاد ہیں۔

یہ احکامات موصول ہوتے ہی سی آئی اے کے ایجنٹوں نے اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔ ان سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے سی آئی اے کا ایک ایجنٹ ایمل پوپیو لکھتا ہے

"مئی ۵۸ء میں صدر سوئیکارنو کی بری فوج نے ہمارا ایک بی ۲۶ بمبار طیارہ مار گرایا۔ اور ہمارے ہواباز ایلین لارنس پوپ کو گرفتار کر لیا۔ اس وقت ہم صدر سوئیکارنو کے خلاف برسرپیکار تھے۔ ہمیں سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر سے احکامات موصول ہوئے کہ ہم لارنس پوپ کو ہر قیمت پر آزاد کرائیں۔ ہمیں اپنے جاسوسوں سے یہ اطلاع موصول ہو چکی تھی کہ لارنس پوپ امبون کی جیل میں محبوس ہے۔ اور آج رات اس کو جکارتہ جیل میں منتقل کر دیا جائیگا۔"

"ہم نے اپنے ساتھی کو چارسکی کو وائرلس پر پیغام دیا کہ ہم تینوں یعنی میں، باب پورے اور ریلیکس شسٹر بذریعہ طیارہ اس کے پاس پہنچ رہے ہیں۔ ہم نے طیارہ ایک جنگل میں اتارا اور اس کو جھاڑیوں وغیرہ میں چھپا کر امبون کے سامنے والے ساحل سمندر پر پہنچ گئے وہاں ہمارے بیس ساتھی ہماری راہ تک رہے تھے۔ ہم سب ایک کشتی میں سوار ہو کر امبون کے ساحل پر جا اترے اور کشتی کو ساحلی جنگل میں چھپا دیا۔ اس وقت ہم ٹامی گنوں۔ دستی بموں اور رائفلوں سے مسلح تھے۔"

"ہم بلا مزاحمت جیل خانے کے قریب میں پہنچ گئے۔ چاروں طرف پُرہول سناٹا طاری تھا۔ تاریکی اتنی تھی کہ کچھ بھی سجھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن ہمیں اس امر پر ازحد حیرت تھی کہ دور دور تک کسی پہرے دار کے آثار نہیں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ علاقہ خالی پڑا ہے۔ اور وہاں پر کوئی بھی ذی روح موجود نہیں ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہمارے جاسوس بھی وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے ہمارے بدترین خدشات کی تصدیق کر دی کہ اب وہاں کوئی بھی متنفس موجود نہیں تھا۔ لارنس پوپ کو سر شام ہی جکارتہ بھیجا جا چکا تھا۔ اس مایوس کن اطلاع نے ہمارے تمام تر ارادوں پر پانی پھیر دیا اور ہم بددل ہو کر حالات پر مزید غور و خوض کرنے کی خاطر جنگل کی طرف واپس چلے گئے۔"

"میک ولیم نے مشورہ دیا کہ یا تو صدر سوئیکارنو کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے اور یا پھر اس کی بیٹی رکمتی کو اغوا کرکے بطور یرغمال اپنے پاس رکھ لیا جائے اور پھر اس کے عوض لارنس پوپ کا سودا کیا جائے۔ میک ولیم کا خیال تھا کہ لارنس کو آزاد کرانے کے لئے یہ ترکیب بڑی کارگر ثابت ہوگی۔ لیکن اس میں ایک کمزوری تھی اور وہ یہ کہ رکمتی صدر سوئیکارنو کی منہ بولی بیٹی تھی۔ لہٰذا یہ عین ممکن تھا کہ صدر اس کے عوض لارنس پوپ کا سودا کرنے سے یکسر منکر ہو جائے لہٰذا اس میں کئی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ انہی وجوہات پر یہ تجویز رد کر دی گئی۔"

"پھر اس تجویز پر غور شروع کیا گیا کہ آیا صدر سوئیکارنو کا قتل مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر اس کو قتل کر دیا جائے تو اس کی حکومت زمین بوس ہو جائے گی اس طرح ہم نہ صرف لارنس پوپ بلکہ پورے انڈونیشیا کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کافی بحث مباحثہ کے بعد اس تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔"

"اس پرخطر مہم کو کامیابی سے ہمکنار کرانے کے لئے تین جانباز منتخب کئے گئے۔ ان میں میرے علاوہ میک ولیم اور ایلیکس شنٹر شامل تھے۔ اپنی مہم کو سرانجام دینے کے لئے ہم جکارتہ پہنچے اور ہم نے اپنے ایجنٹوں سے رابطہ قائم کیا۔ ان کو اپنے کوڈ الفاظ

فوجی امداد کی فراہمی اور انقلابی کونسل کو انڈونیشیا کی قانونی حکومت تسلیم کئے جانے کی درخواست کو امریکی خبر رساں ایجنسی نے تمام دنیا میں پھیلا دیا

انڈونیشیا کو منانے کے لئے امریکہ نے ہزاروں ٹن چاول کی رشوت پیش کی

سے آگاہ کیا اور پھر سربکف اپنی مہم پہ روانہ ہو گئے"۔

"لیکن راہ میں ہمارا خیال تبدیل ہو گیا۔ ہم نے سوچا کہ سوئیکارنو کے قتل سے زیادہ فائدہ ہمیں اس کے اغواء کرنے میں ہوگا اس طرح ہم ان لوگوں سے اپنی من مانی شرائط با آسانی منوا سکیں گے۔"

"صدر سوئیکارنو جکارتہ میں ایوان صدر میں فروکش تھے۔ ایوان صدر کے بارے میں ہمارے ایجنٹوں کی رائے یہ تھی کہ اس میں داخل ہونا ناممکن اور پھر زندہ واپس نکل آنا عقل و فہم سے بعید ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اگر ایسا کرنا ممکن ہوتا تو وہ اس پر کبھی کے عمل پیرا ہو چکے ہوتے۔۔۔ ان حوصلہ شکن حالات کے باوجود ہم نے ہمت نہ ہاری اور اپنے ایجنٹوں کی رپورٹوں کا باقاعدگی سے تجزیہ کرتے رہے۔ ان سے ہمیں ایسے مقامات کا پتہ چلا جہاں سے داخلہ ناممکن نہیں ہو سکتا تھا۔"

"بالآخر وہ دن آن پہنچا جس کے لئے ہم نے شب و روز محنت کی تھی۔ مئی کی ایک رات ہم پانچ آدمی ایوان صدر کی جانب روانہ ہو گئے۔ ہمارے پاس پستول اور دیگر اسلحے کے علاوہ انتہائی تیز دھار خنجر بھی تھے۔"

"نصف شب کے قریب ہم لوگ محل کے عقبی علاقے تک جا پہنچے۔ میں اور میک ولیم وہیں ٹھہر گئے جبکہ باقی ساتھی شمالی اور مشرقی دروازوں کی جانب بڑھ گئے۔ طے شدہ وقت پر انہوں نے دستی بم پھینکے اور سنتریوں پر ٹامی گن سے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ اس طرح ایوان صدر کے محافظین کی توجہ اس طرف مبذول ہو گئی جہاں پر یہ ہنگامہ اٹھ رہا تھا۔ ہم نے ان کی غفلت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور کمند کے ذریعے عقبی دیوار پر چڑھ گئے۔ دوسری طرف ایک طویل و عریض پائیں باغ تھا۔ وہاں دو سپاہی مستعدی سے کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں سنگینوں والی رائفلیں تھیں۔ ہم بے آواز ان کی پشت پر پہنچ گئے اور ان کے سروں پر ٹامی گنوں کے بٹ پوری قوت سے رسید کئے۔ دونوں محافظ بے آواز ڈھیر ہو گئے۔"

"ہمیں یقین واثق ہے کہ محل کے اندر صدر سوئیکارنو کی حفاظت کا غیر معمولی بندوبست ہوگا کیونکہ ہمارے ساتھی اکثر ان پر حملے کرتے رہتے تھے لیکن ہمارا یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا۔ اب ہمیں معلوم ہو رہا تھا کہ شدید ترین خطرات میں گھرے ہونے کے باوجود صدر سوئیکارنو کو اپنی حفاظت کی زیادہ فکر نہیں معلوم ہوتی تھی کیونکہ ہمیں ان دو سپاہیوں کے علاوہ اور کوئی محافظ نظر نہیں آیا۔"

"ہم بعجلت تمام اپنے ایجنٹوں کے مہیا کردہ نقشے کے مطابق صدر سوئیکارنو کی خوابگاہ کی طرف بڑھے۔ چاروں طرف پُراسرار خاموشی طاری تھی۔ ایوانِ صدر بالکل خالی دکھائی دے رہا تھا۔"

"اب ہم ایک طویل و عریض ہال میں پہنچ چکے تھے۔ یہ ہال بھی خالی پڑا تھا لیکن اس سے آگے ایک راہداری میں ایک مسلح پہرے دار نظر آیا۔ اس کو بھی ٹامی گن کے بٹ سے بے ہوش کر کے ہم نے بھاگتے ہوئے سیڑھیاں عبور کیں۔ اچانک ایک انڈونیشی خاتون سامنے آگئی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ پتھر کی طرح ساکت رہ گئی۔ وہ اتنی خوفزدہ ہو گئی تھی کہ اس کے منہ سے چیخ بھی نہ نکل سکی۔ میک ولیم پستول تان کر آہستہ سے بولا۔

"شور مت کرنا ورنہ ——" اس نے پستول کو جھٹکا دیا لیکن وہ خاتون متوحش ہو کر واپس بھاگ نکلی۔ پستول کا استعمال اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ لہٰذا میک ولیم اس کے پیچھے لپکا۔ فرش پر بیش قیمت دبیز قالین ہونے کی وجہ سے اس بھاگ دوڑ میں کوئی آواز نہ ہوئی ورنہ عین ممکن تھا کہ کوئی محافظ ہوشیار ہو جاتا۔ میک ولیم نے چند چھلانگوں میں اس کو جا لیا اور اس کی ٹانگوں میں ٹانگیں الجھا کر اسے گرا لیا۔ میں نے اس عرصے میں سامنے والا دروازہ کھول لیا تھا۔ یہ ایک شب خوابی کا کمرہ تھا جس میں دو عورتیں اضطراب کے عالم میں ٹہل رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر یہ بھی سہم گئیں۔ اسی اثناء میں میک ولیم بھی اندر آگیا۔ خدا جانے وہ پہلی عورت کا کیا حشر کر آیا تھا۔ اس نے پستول کی نالی دکھا کر ان عورتوں کو وہیں پر کھڑا کیا اور میں برابر کے کمروں میں صدر سوئیکارنو کو تلاش کرنے لگا لیکن سب کمرے خالی پڑے تھے۔ بالآخر میک ولیم نے ایک عورت کے سینے پر پستول رکھ کر پوچھا

"سوئیکارنو کہاں ہے؟"

وہ عورت خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔ اس نے ہکلاتے ہوئے بمشکل تمام بتایا کہ وہ سیمارنگ چلا گیا ہے یہ سن کر گویا ہماری کمر ہی ٹوٹ گئی۔ محل سے ناکام و نامراد واپس آکر ہم نے اپنے جاسوسوں کو سیمارنگ بھیجا تاکہ وہاں جا کر یہ جائزہ لیں کہ آیا اس جگہ سوئیکارنو کو قتل یا اغوا کرنا ممکن ہے۔"

"لیکن اس کے بعد ہمیں اس مہم سے سبکدوش کر کے گوریلوں کی تربیت پر مامور کر دیا گیا۔"

سی آئی اے کے ایک ایجنٹ کی یہ خود نوشت واضح طور پر ثابت کرتی ہے کہ امریکی حکومت ایک طرف تو خود سوئیکارنو کو اغوا کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی اور دوسری طرف اس موقف کا اعادہ کر رہی تھی کہ وہ انڈونیشیا کے امور میں قطعاً غیر جانبدار ہے کیونکہ اس کا یہ داخلی معاملہ ہے۔

جب امریکی حکومت ناجائز طریقوں سے بھی ایلن لارنس پوپ کو رہا کرانے میں کامیاب ہو گئی تو اس نے ایک نئی چال چلی۔ صدر کینیڈی نے صدر سوئیکارنو کو امریکہ کا دورہ کرنے کی دعوت دی جو منظور کر لی گئی۔ اس دورے کے دوران صدر کینیڈی نے ایک مرتبہ بھری محفل میں کہا تھا:

"اگر صدر سوئیکارنو ہمیں پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھتے تو کیا ہوا۔ یہ کیا کم ہے کہ وہ ان لوگوں سے ملنا بھی گوارا کر لیتے ہیں جنہوں نے ان کے خیال کے مطابق ان کا تختہ الٹنے کی کوشش کی تھی۔"

باقی صفحہ ۴۲ پر

مختلف طبقات کے سیاسی اور اقتصادی رشتوں کا تاریخی پس منظر

شوکت صدیقی

دراصل ہماری معیشت ہنوز اس مرحلے میں داخل نہیں ہوئی تھی جب سرمایہ داری حقیقی اجارہ داری کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ یہ قصور ہے ان ماہرینِ اقتصادیات کا جنہوں نے یہ معاشی پالیسی وضع کی اور یہ ماہرینِ اقتصادیات ہماری نوکر شاہی کے وہ ارکان ہیں جنہیں ورثے میں برطانوی نو آبادکاروں کا ذہن ملا۔ ان کی فکر اب تک اس حصار سے باہر نہیں نکل سکی۔ وہ آج بھی اپنے عمل میں برطانوی نو آبادکاروں کے انداز میں سوچتے ہیں۔

نوکر شاہی کے ان ماہرینِ اقتصادیات نے قومی معیشت کو اس طرح وضع کیا کہ زراعت میں قابلِ برآمدات فصلوں پر پوری توجہ صرف کی گئی اور غذائی پیداوار کو نظر انداز کیا گیا۔ یہی طریقِ کار برطانوی نو آبادکاروں نے اپنے دورِ حکومت میں برِصغیر کی زراعت کے باب میں اختیار کیا تھا جس کے نتیجے میں قحط پڑے اور لاکھوں انسان لقمۂ اجل بنے اور یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ اس کا اندازہ برطانوی ماہرِ اقتصادیات اے۔ لوڈے کے اس بیان سے ہوتا ہے۔

"برطانوی نو آبادکاروں نے غذائی پیداوار کو نظر انداز کر کے صرف ان فصلوں کو فروغ دیا۔ جو برآمدات کے کام آتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جگہ جگہ قحط پڑنے لگے چنانچہ انیسویں صدی کے آخری ۲۵ برس میں قحط سے مرنے والوں کی تعداد ڈیڑھ کروڑ سے بھی زیادہ ہوگئی۔ غذائی پیداوار سے بے توجہی کے باعث جو صورتِ حال پیدا ہوئی اس کا اندازہ صرف چاول کی پیداوار سے لگایا جا سکتا ہے جو انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں ایک ہزار پونڈ فی ایکڑ سے گھٹ کر سات سو پونڈ فی ایکڑ رہ گئی تھی۔ ۱۹۲۰ء تک بیس سال کے عرصہ میں غذائی پیداوار میں بیس لاکھ ایکڑ کی کمی ہوگئی اور قابلِ برآمدات فصلوں کا علاقہ بڑھ کر قابلِ کاشت زمین کا ۱/۵ ہوگیا۔

(ہندوستانی قحط کی تاریخ اور معیشت)

نوکر شاہی کے اس غلط اندازِ فکر کے علاوہ ہماری زرعی معیشت کی نشوونما میں سب سے بڑی رکاوٹ جاگیرداری ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جسے معاشرتی تبدیلی اور اس کی ترقی کے عمل میں سب سے پہلے ختم ہو جانا چاہئے اس کا وجود معاشی دشواریوں کا سب سے بڑا سبب ہے جب تک یہ طبقہ موجود ہے اس وقت تک صنعت اور زراعت میں مطابقت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور جب تک صنعت اور زراعت میں مطابقت پیدا نہ ہوگی ملک بحران کا شکار رہے گا۔ بنیادی مسائل حل نہیں ہو سکیں گے۔

اس تجزیہ کے بعد ایک بار پھر یہ سوال ابھرتا ہے کہ مہنگائی، بے روزگاری اور بدعنوانیوں کے خلاف عوامی جدوجہد کیوں ابھری اور اس مرحلہ پر کیوں ابھری؟ اس کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب یہ ہے کہ معاشرہ

عوامی جد و جہد کا تجزیہ :- ۲

کبھی ایک حالت میں نہیں رہتا۔ وہ ہمیشہ تغیر پذیر رہتا ہے اور ترقی کی جانب بڑھتا رہتا ہے اس تاریخی عمل میں وہ ایک معاشرتی نظام سے تبدیل ہو کر دوسرے نظام کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہ معاشرتی ارتقا کا قانون ہے۔ تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے۔

معاشرہ تبدیلی کا مطالبہ اس وقت کرتا ہے جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ پیداواری رشتے، پیداواری قوتوں کے کردار سے مطابقت ختم کر دیتے ہیں۔ ان میں تصادم شروع ہو جاتا ہے۔ اس وقت معاشی بحران پیدا ہوتا ہے ذرائع پیداوار پر نجی ملکیت، طریقِ پیداوار کے معاشرتی کردار اور پیداواری قوتوں کے کردار کے ساتھ بے جوڑ ہو جاتی ہے۔ اس مرحلے پر بے روزگاری بڑھتی ہے۔ مہنگائی شدت اختیار کرتی ہے اور بدعنوانیاں پھیلتی ہیں۔ اس معاشی بحران اور اس سے پیدا ہونے والی صورتِ حالات کا اختتام پیداواری قوتوں کی تباہی یا تبدیلی پر ہوتا ہے طریقِ پیداوار کے معاشرتی کردار اور پیداواری قوتوں کے کردار کی یہ عدم مطابقت بذاتِ خود معاشرتی انقلاب کی معاشی بنیاد کی تشکیل کرتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مروجہ پیداواری رشتے ختم کر دیئے جائیں۔ اور ایسے پیداواری رشتے پیدا کئے جائیں جو پیداواری قوتوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔

لیکن اس بات کو سمجھنے کے لئے مناسب ہوگا کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ معاشرتی زندگی کے پیچیدہ حالات میں وہ کون سی خاص قوت ہے جو معاشرے کے طبعی حالات، معاشرتی نظام کے کردار اور ایک نظام سے دوسرے نظام میں معاشرے کی ترقی کا تعین کرتی ہے؟ یہ قوت ہے زندگی کے ان وسائل کو فراہم کرنے کا طریقِ کار جو انسانی وجود کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ یہ مادی اقدار کی پیداوار کا طریقِ کار ہے۔ مادی اقدار سے مراد ہے۔ خوراک، لباس، گھر، ایندھن اور آلاتِ پیداوار وغیرہ یہ مادی اقدار زندگی کے لئے اور معاشرے کی ترقی کے لئے ناگزیر ہیں۔

زندہ رہنے کے لئے عوام کے پاس خوراک، لباس اور گھر کا ہونا ضروری ہے۔ ان مادی اقدار کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ عوام انہیں پیدا کریں۔ اور انہیں پیدا

۱۹۶۸ء کی عوامی تحریک کسی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ نہیں تھی

کرنے کے لئے ضروری ہے کہ عوام کے پاس آلات پیداوار ہوں، جن کے ذریعے وہ خوراک اور لباس پیدا کر سکیں۔ مکان تعمیر کر سکیں۔ اس مقصد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ آلات پیداوار پیدا کریں اور انہیں استعمال کریں۔ یہ آلات، جن کے ذریعے ضروریات زندگی پیدا کی جاتی ہیں اور عوام، جو اپنے پیداواری تجربے، محنت اور صلاحیت سے آلات کے ذریعے پیداوار کرتے ہیں، مل کر معاشرے کی پیداواری قوتیں کہلاتے ہیں

یہ پیداواری قوتیں، جن کی تشکیل آلات پیداوار اور عوام کے اشتراک سے ہوتی ہیں۔ پیداوار کا ایک پہلو ہیں یعنی پیداوار کی صرف ایک کیفیت، پیداوار کا دوسرا پہلو یعنی پیداوار کی دوسری کیفیت، وہ رشتہ ہے جو انسان طریق پیداوار کے دوران ایک دوسرے کے ساتھ پیدا کرتے ہیں۔ انسانی فطرت کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں اور اس طرح فطرت کو مادی اقدار یعنی ضروریات زندگی کے لئے استعمال میں لاتے ہیں۔ لیکن یہ عمل وہ ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہ کر نہیں بلکہ مشترکہ طور پر گروہوں یا تنظیموں کی شکل میں انجام دیتے ہیں لہٰذا پیداوار ہر زمانے ہر نظام اور ہر حالت میں معاشرتی پیداوار ہی ہے۔ ضروریاتِ زندگی کی پیداوار کے دوران پیداواری عمل کے اندر رہ کر، وہ کسی نہ کسی نوعیت کے باہمی رشتے میں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں۔ یہی رشتے پیداواری رشتے کہلاتے ہیں۔ یہ رشتے طبقاتی معاشرے میں جاگیردار اور کسان، آجر اور مزدور استحصال کرنے والے اور استحصال کا شکار ہونے والے اور حاکم و محکوم کے رشتے ہیں۔ لیکن ایسے معاشرے میں جو استحصال سے آزاد ہو یہ عوام کے درمیان تعاون اور باہمی امداد کے رشتے ہوتے ہیں۔ پیداواری رشتے خواہ کیسے بھی ہوں، ہر دور اور ہر نظام میں معاشرے کی پیداواری قوتوں کی حیثیت سے اتنے ہی ضروری ہیں۔ جتنا کوئی بھی دوسرا پیداواری عنصر ہو سکتا ہے۔

پیداواری رشتوں اور پیداواری قوتوں میں بنیادی عنصر پیداوار ہے اور پیداوار کی اولین خاصیت یہ ہے کہ وہ زیادہ عرصہ تک ایک حالت میں نہیں رہتی بلکہ ہمیشہ ترقی اور تبدیلی کی جانب گامزن رہتی ہے ترقی اور تبدیلی کے اس عمل سے طرز (Mode) پیداوار تبدیل ہوتی ہے جو لازمی طور پر تمام معاشرتی نظام میں، سیاسی نظریات میں اور سیاسی اداروں میں تبدیلیاں لاتی ہے۔ اور اس طرح یہ تبدیلی پورے معاشرتی نظام اور سیاسی نظام کی تعمیر نو کا مطالبہ کرتی ہے۔

پیداوار کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تبدیلی اور ترقی ہمیشہ پیداواری قوتوں کی ترقی اور تبدیلی کے ساتھ شروع ہوتی ہے لیکن اس تبدیلی اور ترقی کا آغاز سب سے پہلے آلات پیداوار میں ترقی اور تبدیلی سے ہوتا ہے۔ اس حیثیت سے پیداواری قوتیں پیداوار کا سب سے زیادہ متحرک اور انقلابی عنصر ہیں پہلے معاشرے کی پیداواری قوتیں تبدیلی اور ترقی اختیار کرتی ہیں، پھر اس تبدیلی پر انحصار کرتے ہوئے اور ان کی مطابقت سے انسانوں کے پیداواری رشتے تبدیل ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پیداواری رشتے پیداواری قوتوں کی ترقی اور تبدیلی کو متاثر نہیں کرتے۔ جیسی پیداواری قوتیں ہوں ویسے ہی پیداواری رشتے بھی ہونے چاہیئے۔

ہمارہ معاشرہ اس مرحلے پر پہنچ گیا ہے کہ معاشی نظام میں تبدیلی ناگزیر بن گئی ہے

پیداوار کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ پیداواری قوتیں اور ان سے مطابقت رکھنے والے پیداواری رشتے پرانے نظام سے غیر متعلق رہ کر نہیں بلکہ اس کے اندر رہ کر نمودار ہوتے ہیں۔ یہ صورت انسان کے سوچے سمجھے اور شعوری عمل سے نہیں بلکہ خود بخود اور انسانی خواہشات سے بے نیاز ہو کر پیدا ہوتی ہے۔ اس کے دو اسباب ہیں:

۱: انسان کو یہ آزادی حاصل نہیں ہوتی کہ وہ ایک طرز پیداوار کی بجائے دوسرا اختیار کر لے اس لئے کہ ہر نسل جب عملی زندگی میں داخل ہوتی ہے تو اسے ایسی پیداواری قوتوں اور پیداواری رشتوں سے سابقہ پڑتا ہے جو پچھلی نسلوں کے کام کا نتیجہ ہوتے ہیں لہٰذا وہ انہیں قبول کرنے پر مجبور ہوتی ہے اور ہر وہ چیز جو پیداوار کے دائرۂ کار میں پہلے سے موجود ہوتی ہے اور اسے اختیار کر لیتی ہے تاکہ وہ ضروریاتِ زندگی پیدا کر سکے۔

۲: آلاتِ پیداوار اور پیداواری قوتوں کے کسی بھی عنصر کو جب ترقی دی جاتی ہے تو انسان کو یہ علم نہیں ہوتا کہ اس ترقی سے کیا معاشرتی نتائج برآمد ہوں گے۔ وہ صرف اپنے روزمرّہ کے مفادات پر نظر رکھتا ہے۔ محنت کو ہلکا کرنے کے اسباب پر توجہ دیتا ہے اور اس ترقی سے براہِ راست اور مناسب فائدہ حاصل کرنے پر غور کرتا ہے۔ مثلاً جاگیرداری نظام کے دور میں جب یورپ کے ابھرتے ہوئے بورژوا یعنی سرمایہ دار طبقے نے مشینوں سے چلنے والی فیکٹریاں اور کارخانے لگانے شروع کئے تو اس طرح اس نے معاشرے کی پیداواری قوتوں کو آگے بڑھایا تھا مگر اسے ہرگز یہ علم نہ تھا کہ اس تبدیلی اور ترقی سے کیا معاشرتی نتائج برآمد ہوں گے۔ اسے یہ گمان بھی نہ تھا کہ یہ "معمولی" تبدیلی معاشرے کو معاشرتی قوتوں کی نئی گروہ بندی کی جانب لے جائے گی اور جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بادشاہ اور امراء جنہوں نے فیکٹریوں کے قیام پر نہایت خوشنودی کا اظہار کیا تھا، ان کے

موجودہ سیاسی تبدیلی مسائل کا حل نہیں ہے

اقتدار کا انقلاب کے ذریعہ تختہ الٹ دیا جائے گا۔

لیکن یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ پیداواری رشتوں میں تبدیلی یعنی پرانے پیداواری رشتوں کی نئی پیداواری رشتوں میں منتقلی بغیر کسی تصادم یا انقلابی عمل کے آسانی کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ایسی تبدیلی عام طور پر اس وقت ہوتی ہے جب پرانے پیداواری رشتوں کو انقلابی عمل سے ختم کر کے نئے پیداواری رشتے قائم کئے جاتے ہیں۔ البتہ پیداواری رشتوں کی ترقی اور پیداواری رشتوں میں تبدیلیاں کچھ عرصہ تک انسانی خواہشات سے بے نیاز ہو کر آزادانہ طور پر ہوتی ہیں۔ یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک نئی نسل اور ترقی پذیر قوتیں پختگی کے ایک خاص مرحلے تک نہیں پہنچ جاتیں۔ اس کے بعد نئی پیداواری قوتیں مستحکم ہو جاتی ہیں۔ اس وقت موجودہ پیداواری قوتیں اور ان پر کنٹرول والے حکمران طبقے اس کی راہ میں ایسی زبردست رکاوٹ بن جاتے ہیں جنہیں ابھرتے ہوئے نئے طبقے صرف شعوری عمل اور قوت یعنی انقلاب کے ذریعے ہٹا سکتے ہیں۔

اس مرحلے پر ایسے نئے معاشرتی تصورات، نئے سیاسی ادارے اور ایک نئی سیاسی قوت ابھر کر سامنے آتی ہے جس کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ قوت کے ذریعے پرانی پیداواری قوتیں ختم کر دی جائیں۔ نئی اور پرانی قوتوں کے اس تصادم اور معاشرے کے نئے معاشی تقاضوں سے نئے معاشرتی تصورات جنم لیتے ہیں۔ یہ نئے تصورات عوام کو منظم کرتے ہیں۔ انہیں متحرک کرتے ہیں۔ نئے تصورات اور نظریات جب عوام کے ذہنوں میں جگہ بنا لیتے ہیں تو وہ زبردست مادی قوت بن جاتے ہیں۔

غرض کہ ۱۹۶۸ء کے اوائل میں جو سیاسی صورتِ حال پیدا ہوئی وہ کسی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ نہ تھی۔ یہ تاریخی عمل تھا۔ معاشرہ ایک ایسے مرحلہ پر آگیا تھا جہاں پیداواری رشتوں کی پیداواری قوتوں کے ساتھ مطابقت ختم ہو گئی تھی۔ ان میں تصادم پیدا ہوا جس نے معاشی بحران کو جنم دیا اور اس کے نتیجے میں مہنگائی بڑھی۔ بے روزگاری شدید ہوئی بدعنوانیاں پھیلیں۔ عوام میں بے چینی پیدا ہوئی۔ ہمارا معاشرہ اس مرحلہ پر آگیا جب وہ معاشی نظام میں تبدیلی کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ صورتِ حال ہنوز برقرار ہے۔

سیاست چونکہ معیشت سے ہٹ کر اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی بلکہ معیشت ہی کی متحد شکل ہوتی ہے لہٰذا یہ سمجھنا کہ صرف سیاسی تبدیلی ہی موجودہ مسائل کا حل ہے مناسب نہیں۔ معاشی تبدیلی اس کے لئے بنیادی شرط ہے۔ یہ معاشی اور معاشرتی تبدیلی کس طرح اور کس طرح ہو سکتی ہے۔ حالات کیا رخ اختیار کریں گے اس کے لئے ضروری ہے کہ مختلف طبقات اور ان کے اقتصادی اور سیاسی رشتوں کا پاکستان کے تاریخی پس منظر میں تجزیہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ مختلف ادوار میں ان کا کیا طبقاتی کردار رہا ہے اور اس مرحلہ پر ان کی حیثیت کیا ہے۔ موجودہ سیاسی صورتِ حال کو سمجھنے کے لئے یہ تجزیہ نہایت ضروری ہے۔ (جاری ہے)

اُس وقت ہمارے دوست ہمیں مِلتے ہوئے گھب

محمود شام

ہم صبح سویرے ٹھٹھ انسپکشن ہاؤس میں پہنچ گئے۔ وہاں پورے سندھ کی پیپلز پارٹی جمع تھی۔ مخدوم زماں طالب المولیٰ، میر رسول بخش تالپور، میر علی احمد تالپور، جام صادق علی، صادق علی میمن، محمد خان سومرو، قمر الزماں شاہ، میر غلام رسول شاہ جیلانی، کراچی سے معراج محمد خاں، طارق عزیز، عبدالحفیظ پیرزادہ، قاسم پٹیل، سوداگر درویش، جاموٹ ولی محمد، عبداللہ بلوچ، عبدالستار گبول، محمد علی گبول، جانا کراچی تھا۔ بھٹو صاحب تیار تھے۔ مگر میر رسول بخش تالپور صاحب حسبِ معمول تیار نہیں تھے۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ ایسے سفر میں بھٹو صاحب صبح سویرے بالکل تیار ہوتے ہیں، اور میر صاحب کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ روہڑی سے تیز گام چلی تو ملتان کینٹ کے اسٹیشن پر بھٹو صاحب صبح چھ بجے لوگوں سے خطاب بھی کر چکے تھے۔ میر صاحب ابھی کروٹ بدل رہے تھے۔ میر صاحب کی اصل میں رات گئے تک پرانے قصّوں اور لطیفوں کی محفل جمتی ہے۔ اس میں دیر سے سونے کی وجہ سے صبح پر اثر پڑتا ہے۔ کراچی چلنے لگے تو صادق علی میمن کہنے لگے ساکرو وغیرہ کے لوگ بھی بھٹو صاحب کے منتظر ہیں یہاں بھٹو صاحب امیدوار تھے، اس لئے وہاں جانا ضروری ہے۔ بھٹو صاحب کو کراچی کی فکر تھی، اور جلدی آنے کا وعدہ کر کے ادھر چل پڑے۔

ہم نے سوچا کہ ہم گھارو جا کر رکیں۔ اور وہاں سے قافلے کے ساتھ ہولیں گے۔ گاڑی بیرسٹر کمال اظہر کی تھی سٹیرنگ پر امان اللہ تھے۔ باقی ہمارے ساتھ رفیق احمد میاں اور حمید بھابھے تھے اور بہت سی گاڑیاں بھی گھارو پہنچ چکی تھیں، جو بھٹو صاحب کی منتظر تھیں، اتنے میں گاڑیوں کا ایک قافلہ "جئے بھٹو" کے نعرے لگاتا گزرا۔ اس میں بیگم بھٹو، ڈاکٹر شمیم زین الدین، دوسری خواتین، بھٹو صاحب کے صاحبزادے مرتضیٰ بھٹو اور ان کے انقلابی "ساتھی تھے ہمیں فوراً احساس ہوا کہ یہ لوگ سیدھے ٹھٹھ پہنچ جائیں گے۔ اور بھٹو صاحب کا قافلہ ساکرو سے دوسری سڑک کے ذریعے ادھر پہنچیں گے۔ اس لئے ان کے پیچھے



...راتے تھے



گاڑی دوڑائی اور انہیں چھٹے ساتویں میل پر جالیا۔ یہ لوگ ساکرو کی طرف چلے گئے وہاں سے بھٹو صاحب کے قافلے کے ساتھ لوٹے۔ کراچی ۱۲ بجے پہنچنا تھا مگر گھارو قافلہ پونے ایک بجے کے قریب آیا۔ اس لئے یہاں بھٹو صاحب بغیر کچھ کہے، آگے بڑھ گئے۔ تاکہ کراچی وقت پر پہنچ سکیں۔ یہی حال رستے میں دوسری جگہوں پر بھی رہا۔ لانڈھی سے آگے چند منٹ کے لئے یہ قافلہ رکا، کیونکہ چند بچیاں۔ انہیں ہار پہنانا چاہتی تھیں۔ ذرا آگے بڑھے تو میر مرتضیٰ بھٹو کی گاڑی کا ایک ٹائر پنکچر ہو گیا۔ اس میں طارق عزیز اور معراج محمد خان بھی تھے۔ مرتضیٰ بھٹو تو فوراً کوٹ قمیض اتار کر ٹائر بدلنے میں لگ گئے۔ ہم نے معراج اور طارق کو اٹھا لیا تاکہ وہ جلوس سے لیٹ نہ ہو جائیں بھٹو صاحب طیارے میں رکے۔ شکریہ ادا کیا۔

ہم میٹروپول کے چوراہے میں پہنچے تو ایک اژدھام نظر آیا سر ہی سر تھے۔ ہماری گاڑی عقیدتمندوں میں گھر گئی۔ معراج اور طارق عزیز لوگوں کی نگاہوں کا مرکز تھے۔ بڑا لمبا چکر کاٹ کر ہم ٹرک میں پہنچ سکے۔ ٹرک میں سوار ہونا بھی خاصا مشکل تھا کیونکہ رضا کار اصولوں کے سخت پابند ہیں۔ جیول مائیک سنبھالے تھے۔ ساتھ میں حنیف سولجر بیٹھے تھے۔ راجہ لیاقت اور رصید امداد حسین شاہ ممبر صوبائی اسمبلی۔ بھٹو صاحب پہنچے تو وکٹوریہ روڈ بونس روڈ اور چوراہوں میں ٹھہرا انسانوں کا سیلاب کا لہریں لینے لگا۔ ٹرک رینگنے لگا، سیلاب بھی بہنے لگا۔ میں پہلے ٹرک میں نیچے بیٹھا تھا۔ جہاں سے سیلاب کی ہلچل بڑی عجیب لگتی تھی۔ ہم لوگوں کو دیکھ سکتے تھے لوگ ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ نعرے گونج رہے تھے۔

"مزدوروں کا لیڈر بھٹو ہے"

"کسانوں کا لیڈر بھٹو ہے"

"عوام کا لیڈر بھٹو ہے"

"مزدور کا نعرہ ہے —— پاکستان ہمارا ہے"

"مزدور بھٹو سرمایہ دار و —— پاکستان ہمارا ہے"

لیکن ایک نعرہ سب سے زیادہ جوش کے ساتھ بلند ہوتا تھا وہ تھا "کٹ گئی گردن جھک گیا بازو

ہائے ترازو، ہائے ترازو"

اس سیلاب کی حرکت دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ ٹرک سے نیچے اتر کر میں بھی اس سیلاب کا "حصہ" بن گیا ٹرک پر سید سعید حسن، احمد علی سومرو، این۔ ڈی خان بھی دکھائی دیئے۔ باقی سندھ کے تمام لیڈر تھے۔ اور لیاری کے کارکن تھے۔ ٹرک کے پیچھے پیچھے ایک گاڑی

...صولوں

...پر کوئی

...صالحت

...نہیں

...و سکتی

مغربی اور مشرقی پاکستان کو صرف سوشلسٹ نظام متحد رکھ سکتا ہے

تھی۔ جس میں بیگم نصرت بھٹو، ڈاکٹر شمیم زین الدین اور کچھ دوسری خواتین بیٹھی تھیں۔ اس گاڑی کو بھی کارکن اپنی حفاظت میں لئے تھے۔ مارکیٹوں کی چھتیں، بنگلوں کی کھڑکیاں، فلیٹوں کے دریچے، محبت اور عقیدت کے شہر بنے ہوئے تھے۔ پھولوں کی پتیاں پھوار بن بن کر گر رہی تھیں۔ کہیں کہیں سکے بھی نچھاور ہوتے تھے۔ لوگ عقیدت کے ساتھ نعرہ بلند کر رہے تھے "سو کھا روٹی لایا بھٹو کو لایا"

اس جلوس میں رکشے والے تھے، ریڑھی والے تھے۔ مزدور تھے، طالب علم تھے۔ کلرک تھے۔ یہ غریبوں کا جلوس تھا۔ مزدور کا جلوس تھا۔ وکٹوریہ روڈ، بندر روڈ کھارادر کی بالکونیوں اور چھتوں سے عقیدتیں نچھاور ہو رہی تھیں۔ پھول برس رہے تھے لوگوں کے عقیدت کا اور بندر روڈ کا نظارہ کرنے کے لئے میں ٹرک پر سوار ہو گیا بھٹو صاحب مسلسل ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں کی عقیدت کا جواب دے رہے ہیں۔ یہ دونوں ہاتھ سوا ایک بجے سے ہل رہے ہیں۔ تھک چکے ہوں گے، نہیں آج سوا ایک بجے سے نہیں بلکہ اس وقت سے ہل رہے ہیں جب سے وزارت چھوڑی۔ یہ دو ہاتھ بھٹو کے ہاتھ نہیں۔ استحصال اور ناانصافی کے خلاف بلند ہونے والے ہاتھ ہیں۔ جو صدیوں سے اٹھ رہے ہیں۔ ان ہاتھوں کے ساتھ ہی طوفان بھی اٹھتے ہیں، حشر بھی اٹھتا ہے، بھٹو صاحب ایک بجے سے اس ٹرک پر کھڑے ہیں اور لوگ ایک بجے سے پیدل چل رہے ہیں۔ عوام اور لیڈر میں یہ ہمسفری ہی کسی منزل پہ لے جا سکتی ہے اور لوگ بھی اس سڑک پر کھڑے ہیں۔ اس سیلاب میں لاکھوں لوگ چل رہے ہیں۔ آخر تک دیکھیں کون کون ساتھ چلتا ہے۔ پیراڈائز، ریگل چوک، بندر روڈ جگہ جگہ بھٹو صاحب خطاب کرتے ہوئے عوام کے لئے سراپا تحسین بن رہے ہیں کہ یہ جیت عوام کی جیت ہے۔ انہوں نے ہمارے منشور کو ووٹ دیا ہے اور یہ منشور ہمارے لئے انتہائی مقدس ہے، ہم اسے کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔ اس کے اصولوں پر کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی۔ لوگ بیاس کی شدت کا احساس کرتے ہوئے جلوس پر سنگتروں، مالٹوں، اور کینوؤں کی بارش کر رہے ہیں۔ سنگترے اور مالٹے کیچ کرنے میں سوداگر درویش اور جاموٹ ولی محمد زیادہ ماہر نظر آ رہے ہیں۔ ایک مرتبہ بھٹو صاحب نے بھی ایسی کوشش کی۔ لیکن وہ مالٹا بہت دور گرا۔ شکارپوری مارکیٹ سے ایک غریب آدمی نے خاصے مالٹے پھینکے۔ وہیں ایک چھت پر ایک صاحب ایک بندر لئے بیٹھے تھے۔ بھٹو صاحب نے اسے دیکھا تو حفیظ پیرزادہ سے کہنے لگے دیکھو "سومار بیٹھا ہے"۔ اس سے پہلے بہادر یار مارکیٹ پر جماعتِ اسلامی کا پرچم دیکھ کر انہوں نے کہا تھا کہ "یہ نیشنل کانگریس کا پرچم لہرا رہا ہے" یہ جھنڈا سرنگوں تھا۔ شاید قومی اسمبلی کے انتخابات کے بعد سے اسے سرنگوں کر دیا گیا ہے۔ رستے میں جگہ جگہ بجلی کے تار بھی راستہ روکتے تھے۔ سوداگر درویش سب سے پہلے اس خطرے کا احساس دلاتے تھے "بجلی کا تار ہے اپنا آپ سنبھالو" اس بجلی کے تار آ گئے بڑے بڑے سر جھک جاتے تھے۔ یہ بجلی کے تار بار بار خطرات کا احساس دلا رہے تھے۔

کے۔ ایم۔ سی کی عمارت پر کے۔ ایم۔ سی کے ملازمین نے اس جلوس کا والہانہ استقبال کیا۔ بڑی عقیدت سے ہاتھ ہلا ہلا کر انہوں نے ٹرک میں سوار افراد کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ بھٹو صاحب نے کے۔ ایم سی کے ملازمین کو یقین دلایا کہ اب کے ایم۔ سی۔ کو سرمایہ داروں کے قبضے میں نہیں جانے دیا جائے گا۔ کے۔ ایم۔ سی کا پہلا کام غریبوں کی خدمت ہو گا۔ ہم کے ایم سی کے ملازمین کا بھی پورا تحفظ کریں گے۔

ڈاؤ میڈیکل کالج کی چھت پر نوجوان ڈاکٹر موجود تھے۔ انہوں نے نعرے لگا لگا کر بھٹو صاحب اور معراج محمد خان کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ بھٹو صاحب نے ہاتھ لہرا کر ان کے نعروں کا جواب دیا اور معراج سے کہا "وزارت سے الگ ہونے کے بعد میں نے یہیں ایڈریس کیا تھا۔" میمن مسجد کے قریب انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا: "ایک طرف میمن مسجد ہے۔ خدا کا گھر — دوسری طرف یہ سود خوار کا اڈہ ہے۔ جس طرح یہ مسجد خدا کی ملکیت ہے اسی طرح یہ بنک عوام کی ملکیت ہے۔ حبیب صاحب میرے دوست ہیں۔ ساتھ پڑھتے رہے ہیں لیکن یہاں دوستی کا سوال نہیں ہے اصولوں کا سوال ہے۔ ہم سب بنکوں کو قومی ملکیت میں لیں گے" حبیب بنک کے ملازموں اور یونین کو انہوں نے پورے تحفظ کا یقین دلایا۔ جلوس بندر روڈ، میری ویدر ٹاور سے مڑتا کھارادر کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں بمبئی کی طرف کے حضرات رہتے ہیں۔ فلیٹوں سے بچے، مائیں، بہنیں، بیٹیاں اور بھائی مجسم عقیدت بنے کھڑے تھے۔ اسمٰعیلی حضرات اپنی روایات کے مطابق جلوس پر چاول نچھاور کر رہے تھے۔ ان کے ہاں عقیدت اور فتح کی علامت چاول ہیں۔ اس موڑ پر بھٹو صاحب نے اسماعیلی حضرات کے تعاون کا شکریہ ادا کیا۔

یہ سیلاب لکری گراؤنڈ تک جا پہنچا جہاں بھٹو صاحب کے علاوہ میر رسول بخش تالپور، میر علی احمد تالپور، جے۔ اے۔ رحیم، معراج محمد خاں، طارق عزیز، عبدالحفیظ پیرزادہ، اکبر خاں، ستار گبول، عبدالوحید عرشی، رفیق احمد میاں، کمال اظفر، عبداللہ بلوچ، امداد حسین شاہ، حنیف سولجر، قاسم پٹیل نے بھی خطاب کیا۔ بھٹو صاحب نے اپنی پارٹی کے کامیاب کارکنوں سے کہا کہ وہ وزارتوں کے خواب نہ دیکھیں، ممکن ہے انہیں پارٹی میں جھاڑو تک دینا پڑے۔ وہ اگر وزیر بنے بھی تو پہلے سے وزیر نہ ہوں گے جو کمروں میں بیٹھے ہیں اور سیکرٹری ان کے پاس فائلیں لے کر پہنچ جاتے ہیں اور وہ صرف دستخط کرتے ہیں۔ اب انہیں دستخط نہیں کرنا ہوں گے تھانوں میں جا کر دیکھنا ہو گا کیا ہو رہا ہے۔ گلیوں میں جانا پڑے گا، جھونپڑیوں میں جانا پڑے گا۔ انہیں عوام کے خادم بن کر رہنا پڑے گا۔ انہوں نے بتایا کہ جب انہوں نے عوامی تحریک شروع کی تو ان کے ساتھ صرف چند لوگ تھے، میر رسول بخش تالپور، ڈاکٹر مبشر، مصطفےٰ کھر، شیرپاؤ، معراج محمد خاں۔ اس وقت ہمارے دوست ہمیں ملتے ہوئے گھبراتے تھے، راستہ

باقی صفحہ ۴۲ پر

عوامی رہنما معراج محمد خاں کی "قابلِ اعتراض" تقریر کی یہ دوسری قسط ہے۔ معراج صاحب اس تقریر کے باقی حصے کو ترتیب دینے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ رہائی کے بعد ان کی مصروفیات کی وجہ سے مذکورہ حصے ابھی تک ہمیں نہیں مل سکے۔ توقع ہے کہ انہیں کسی قریبی اشاعت میں شامل کر لیا جائے گا۔ (ادارہ)

مشعلیں بلند کرو اور بے نور نظام کو بدل کر رکھ دو!

حضرات: — آپ نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ میں موجودہ بجٹ اور وزیر خزانہ جناب مظفر علی قزلباش کے سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ وزیر خزانہ کے سلسلہ میں کچھ کہنا چھوٹا منہ اور بڑی بات کی مصداق ہو گا آپ نے اس سلسلہ میں ذوالفقار علی بھٹو کی تقاریر تو پڑھی ہی ہوں گی، اس سلسلہ میں، میں صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ ہمارے عوام پہلے ہی مہنگائی، بیروزگاری اور بھوک و افلاس کا شکار ہیں۔ ان حالات میں وزیر خزانہ جناب مظفر علی قزلباش نے نئے بجٹ میں مزید ٹیکسوں کا اضافہ کر کے غریب عوام کی کمر توڑ دی ہے یہی وجہ تھی کہ نئے بجٹ پر عوام نے شدید تنقید اور تبصرہ کیا — خود تاجروں، صنعت کاروں، زمینداروں اور تقریباً تمام سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں نے بجٹ پر تنقید کرتے ہوئے صدائے احتجاج بلند کی۔ سناروں نے تو احتجاج کے طور پر تقریباً دو ہفتہ تک ہڑتال کی اور اپنا کاروبار بند رکھا — اس عوامی ردعمل کو پیش نظر رکھ کر موجودہ حکومت نے بجٹ میں نئے ٹیکسوں کی مد میں ردوبدل اور ترمیم کی — حکومت نے ۸۰ فیصدی نئے ٹیکسوں کو واپس لینے کا اعلان کیا یہ حکومت کی طرف سے ایک صحت مند قدم تھا — بھائیو! — ذوالفقار علی بھٹو نے نئے بجٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا جب ہمارا بجٹ تیار ہو رہا تھا اس وقت وزیر خزانہ غیر ممالک کے دورے پر تھے۔ آپ ہی بتائیے جب حالات یہ ہوں تو بجٹ کو عوامی امنگوں کے مطابق کیسے بنایا جا سکتا ہے۔

یہ کام تو درحقیقت وزیر خزانہ کا ہوتا ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ بجٹ میں اعتدال رہے اور کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جس سے عوام کی اقتصادی مشکلات میں اور اضافہ ہو — میرے بھائیو! — آپ کو معلوم ہے کہ برطانیہ میں اگر حکومتی پارٹی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا مالیاتی بل دارالعوام میں نامنظور ہو جائے تو وہاں نہ صرف وزیر خزانہ بلکہ پوری کی پوری صاحبِ اقتدار پارٹی کو مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ یقیناً یہ ایک عظیم پارلیمانی جمہوری روایت ہے — یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت ہمارے ملک میں کوئی اسمبلی نہیں — لیکن ایک اسمبلی ضرور ہے — عوام کی اسمبلی — اور عوام کی اسمبلی نے وزیر خزانہ کے بجٹ کو نامنظور کر دیا ہے — میں اپنی پارٹی کی طرف سے صدر یحییٰ خان اور ان کی حکومت سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس جمہوری روایت کو برقرار رکھتے ہوئے وزیر موصوف کو ان کے عہدہ سے برخواست کر دیں۔

لال کرتی کے بزرگو! —

خبر ملی ہے کہ اس علاقہ کی جامع مسجد کے پیش امام جناب مطیع الرحمٰن نے مسجد کے دروازہ پیپلز پارٹی کے کارکنوں پر بند کر دیئے ہیں — مقام افسوس ہے کہ مولانا موصوف نے مسجد کو سیاست کا اکھاڑہ بنا دیا ہے، میں کہتا ہوں کون ہوتا ہے یہ مطیع الرحمٰن کہ خانۂ خدا میں اپنا حکم چلائے — مولانا صاحب! تم داروغہ مسجد بننے کی کوشش مت کرو — مسجد خانۂ خدا ہے۔ یہ جماعت اسلامی کا دفتر نہیں، تمہاری ذاتی جاگیر بھی نہیں کہ جہاں تم فرمان جاری کرو اور عوام کے داخلہ پر پابندی عاید کرو — لوگو! — اسلام کے ان نام نہاد ٹھیکیداروں کے ہاتھوں آج خانۂ خدا کے احترام اور تقدس کو پامال کیا جا رہا ہے — خانۂ خدا میں محبت اور اخوت کا درس دینے کے بجائے یہ نام نہاد علمائے دین سیاسی اختلافات کو ہوا دیتے ہیں، خانۂ خدا میں اسلام کے مقدس نام پر پیپلز پارٹی اور اس کے کارکنوں کے خلاف جہاد کے فتوے صادر کئے جاتے ہیں — ہم نے بہت صبر کیا۔ لیکن اب ہم ہرگز کسی فرد کو عبادت گاہوں میں اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ وہ دوسروں کے سیاسی نظریات پر حملہ کرے اور مذاق اڑائے یا سیاسی اختلاف کی وجہ سے خانۂ خدا میں دوسروں کو عبادت کے حق سے محروم کرے — تاریخ اسلام اس بات کی شاہد و گواہ ہے کہ ان نام نہاد علمائے دین نے ہمیشہ خانۂ خدا کو اپنے ذاتی نظریات کی تبلیغ کے لئے استعمال کیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں



معراج محمد خاں

عوامی اسمبلی نے وزیر خزانہ پر عدم اعتماد کا اظہار کر دیا ہے۔

اسلام کی طرح مسجدوں کو بھی تقسیم کیا۔

لوگو! ــ ہماری عبادت گاہیں پہلے ہی شیعہ سنی وہابی، اہلِ کتاب، بریلوی اور دیو بندی میں بٹی ہوئی ہیں ــ خدا کے واسطہ خانۂ خدا کو مزید تقسیم ہونے سے روکو۔ مطیع الرضا صاحب تم سیاسی بنیادوں پر مسجدوں کی تقسیم کی ناپاک سازش کر رہے ہو اب ہم خانۂ خدا کو کسی حالت میں اور زیادہ تقسیم نہیں ہونے دینگے ــ ہم خانۂ خدا کے تقدس کے محافظ ہیں ــ لوگو! اٹھو!! اور عبادت گاہوں کو تقسیم ہونے سے بچاؤ۔ ورنہ وہ دور آنے والا ہے جب کہا جائے گا یہ کونسل مسلم لیگ کی مسجد ہے یہ کنونشن لیگ کی مسجد ہے، یہ قیوم لیگ کی مسجد ہے، یہ جماعت اسلامی کی مسجد ہے اور ــ اور یہ تحریک استقلال کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہے ــ علامہ اقبال نے ٹھیک ہی کہا تھا ــ "دین ملائی سبیل اللہ" فساد لیکن اے فسادی کٹھ ملاؤ! ہمارے عوام اور پیپلز پارٹی کے کارکن تمہیں خانۂ خدا میں فساد کرنے کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں دیں گے ــ مطیع الرضا صاحب! خانۂ خدا کو سیاسی اکھاڑا مت بناؤ۔ مسجدیں دارالامان ہیں اگر تمہیں سیاست کا شوق ہے تو کرو اخلاقی جرأت آؤ اس میدان میں عوام کے سامنے خادم تمہیں اسلام اور سیاست پڑھانے کے لئے تیار ہے ــ تم سمجھتے ہو عبادت کے لئے ہم تمہارے محتاج ہیں۔ تو یہ تمہاری بڑی غلط فہمی ہے ــ اب وہ زمانہ گزر گیا ــ ہم تم سے زیادہ قرآن اور اسلام کو سمجھتے ہیں ــ ہم تمہارے بغیر بھی اپنے خالق کی عبادت کر سکتے ہیں ــ تم نے پیپلز پارٹی کے کارکن کی نمازِ جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا تھا ــ مت پڑھاؤ نماز جنازہ ۔ ہم خود اپنے رفیقوں اور شہیدوں کو غسل دیں گے اور ان کی نماز جنازہ پڑھائیں گے ــ ہمیں تمہاری امامت کی قطعی ضرورت نہیں، ہمیں تمہاری مساجد کی بھی ضرورت نہیں ہم اپنے خدا کو زمین پر سجدہ دیں گے ــ اقبال نے تمہارے لئے اور تمہاری عبادت گاہوں کے لئے ہی کہا تھا۔

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو"
حق رابسجود منعم آرا بہ طواف
بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!!

لوگو! ــ گزشتہ ڈیڑھ سال کے اندر پاکستان میں ایک ایسا گروہ عالم وجود میں آیا ہے جو اپنے آپ کو "اسلام پسند" کے نام سے یاد کرتا ہے اور جو اپنے خود ساختہ نام نہاد اسلام کی کسوٹی پر کفر کو اسلام اور کبھی اسلام کو کفر میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ ان اسلام پسند حضرات کے بارے اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے ــ

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

انتخابات کے بعد جماعتِ اسلامی کی قلابازیاں؟

جماعت اسلامی کی سیاست کی بنیاد سمجھوتہ بازی اور مذہبی دہشت گردی رہی ہے۔

پروفیسر عتیق احمد

اسلام پسند سیاست کی شکست پر ردعمل کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اس کی تاویلات کبھی عوام کی جذباتیت، ان کی بے شعوری سے کی جا رہی ہے۔ کبھی بھٹو اور مجیب کی کامیابی کو ان کی نعرہ بازی اور جھوٹے وعدوں کی عارضی چمک دمک بتایا جا رہا ہے اور کبھی اسلام پسندوں کے نفاق سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ کبھی آنے والی جمہوریت کو "سفلی جمہوریت" کا پروانہ دیا جا رہا ہے اور کبھی پیپلز پارٹی کے اندر "بدترین تضاد" کی خوشخبری سنائی جا رہی ہے۔ اور کہیں "اسلامی فکر اور اسلامی نظام کی داعی قوتوں کے بے اثر ہو جانے کا نوحہ لکھا جا رہا ہے۔ یہ ہنگامہ خیزی کس طوفان کی نشاندہی کرتی ہے؟ اس سوال کا جواب تو ظاہر ہے کہ آنے والا وقت ہی دے سکے گا۔ تاہم اس صورت حال پر آج ملک کے تمام ترقی پسند عناصر کو غور و فکر کرنا ضروری ہے تاکہ عوام کو اس ممکنہ سازش سے باخبر رکھا جا سکے جس کا پیش خیمہ اسلام پسند سیاست اور صحافت کا موجودہ عوام دشمن رویہ ثابت ہو سکتا ہے۔

بعض حضرات اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ بھٹو اور مجیب کے سیاسی مخالفین بھی چونکہ جمہوریت کی بحالی اور اس کے قیام ہی کے حامی تھے اور ان کا مقصد بھی عوام کی فلاح اور بہبود ہی تھا لہٰذا اب جو ہو چکا سو ہو چکا۔ جن سیاسی پارٹیوں کو معمولی سی کامیابی ہوئی ہے وہ دیانتدارانہ طور پر ایک محب عوام اور حزب اختلاف کا کردار ادا کریں گی۔ ہمیں ذاتی طور پر ان خوش فہم حضرات کو ان کی نیک راہ سے ہٹانا مقصود نہیں ہے۔ لیکن انتخابی مہم کے گیارہ مہینوں میں آج کی اس "حزب اختلاف" کا گزرا ہوا کردار اور ان کے اشاروں اور شہ پر اسلام پسند صحافت کی موجودہ روش اور بھی کچھ سوچنے کی راہیں کھولتی ہے۔

انتخابات میں حصہ لینے والی اسلام پسند سیاسی پارٹیوں کی ماضی میں جو سیاسی روش رہی ہے ان کی اساس ان نکات پر رہی ہے۔

۱- مسلم لیگ (تینوں گروپ) کی سیاست کا محور محلاتی سازش اور توڑ جوڑ رہا ہے۔

۲- جماعت اسلامی کا سیاسی کردار (پی ڈی کے الیکشن کے پیش نظر حصول اقتدار کی خاطر "سمجھوتہ بازی" اور مذہبی دہشت گردی کے سوا کچھ نہیں رہا۔

۳- دوسری مذہبی جماعتوں کا سیاسی کردار موجودہ الیکشن سے پہلے تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس الیکشن میں ان کی روش بھی مذہبی تعصب بلکہ کہیں کہیں جماعت اسلامی کی تقلید میں جارحانہ انداز کی رہی ہے۔

۷ اور ۱۷ دسمبر کے الیکشنوں میں ہر سیاسی جماعت کی شرکت کا واحد مقصد سیاسی اقتدار کا حصول تھا۔ اور اب شکست کے بعد کسی پارٹی کا محض جھینپ مٹانے کے لئے ہار جیت سے بے نیازی کا اظہار کرنا اپنی ٹوٹی ہوئی صفوں کے خلاؤں کو پر کرنے یا اپنے آپ کو جھوٹی تسلیاں دینے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ انتخابی مہم میں ہر سیٹ پر اپنا نمائندہ کھڑا کرنا، اسلام اور پاکستان کی فضا اور بقا کو محض اپنی کامیابی اور ناکامیابی کے مترادف بنا لینا، ہر مخالف سیاسی پارٹی کو اسلام سے برگشتہ اور سرگشتہ ہو جانے کا فتویٰ دے دینا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گھر پھونک قسم کی جان اور مال کی بازی لگا دینا اور ان سب ہتھکنڈوں میں ناکام ہو جانے کے بعد انتخابات سے بے نیازی کا اظہار کر کے عوام کو احمق بنانے کی کوشش کرنا اپنے آپ کو سہانے خواب دکھانے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اشتہار بازی، اور دس گیارہ ماہ تک ایک ایک دن میں کروڑوں کی تعداد میں تین تین رنگوں میں قد آدم پوسٹروں

مسلم لیگوں اور جماعت اسلامی کی حکمت عملی ایک ہے

سے ملک گیر پیمانے پر دیواروں کو پلاسٹر کر دینا، لاکھوں کے اصراف سے شان و شوکت کے دن تین ہفتے منانا، نئے نئے اخبارات اور ہفت روزہ جرائد کے گراں خرچ ہاتھی پالنا۔ صحافیوں اور ضمیر فروش نام نہاد "دانشوروں" کی فوج ظفر موج کو بھرتی کرنا اور اسلام پسندی کے نام پر ملک کے تجارتی سرکاری، غیر سرکاری نوکر پیشہ، مزدور تنظیموں، طلباء، اساتذہ، وکلاء غرض ہر جگہ ایسی نفاقی تقسیم کرا دینا کہ ہر جگہ مد مقابل ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بن جائے۔ یہ سب باتیں اتنی پرانی نہیں کہ عوام انہیں بھول کر اس بات پر یقین کر لیں کہ انتخابات ان اقتدار پسندوں کا مقصد نہیں تھا۔ شکست کے بعد اس بے نیازی کا سیاسی مفہوم در اصل کچھ اور ہی نکلتا ہے۔ پاکستانی سیاسی تاریخ پر جن لوگوں کی گہری نظر ہے ان کے لئے یہ بہت سامنے کی بات ہے کہ جماعت اسلامی کی مذہبی اور سیاسی "حکمت عملی" (تینوں) مسلم لیگوں اور ری پبلکن پارٹی سے کبھی جدا نہیں رہی۔ بلکہ فرق اتنا ہے کہ (تینوں) مسلم لیگوں اور ری پبلکن پارٹی کو ہم آزما چکے ہیں اور جماعت کی سیاست کا "ہلکا سا" متشددانہ رخ ان گذشتہ انتخابات میں دیکھنے کو ملا ہے۔ اور پوت کے پاؤں کے متعلق آزمودہ اور تجربہ کیا ہوا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ پالنے میں نظر آجاتے ہیں۔ باقی رہے اسلامی بھائی چارہ، اسلامی اخوت اور اسلامی اخلاق وغیرہ کے نعرے تو ہمیں یوں لگتا ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب است"۔

اس صورت حال میں جب کہ اسلام کی سربلندی نظریۂ پاکستان کا تحفظ اور جمہوری اقدار اور روایات کا قیام کسی پارٹی کی اپنی فتح و کامرانی کے جلوہ ہائے ناز بن کر رہ جائیں تو اس کے مستقبل کے عزائم اس کے عزائم کی روشنی میں کھلی کتاب کی طرح سامنے آجاتے ہیں۔ اس ضمن میں پہلی قرین قیاس صورت حال یہ ہے کہ جماعت اسلامی اپنی رکن سازی کے "سرخ فیتہ" کی الجھنوں سے نجات پانے سے راہ فرار اختیار کرے گی۔ جوش اور جذبۂ جہاد پیدا کرنے کے لئے مذہب کو ذریعۂ کار بنانا چونکہ خاص الخاص تکنیک ثابت ہوتی رہی ہے۔ لہٰذا ان مٹھی بھر مجاہدین صف شکن کو مرنے مارنے اور اسلامی انقلاب بپا کرنے کے لئے نیز مخالفین کا قبرستان بنانے کے لئے ملک کی ۹/۱۰ آبادی پر کفر' الحاد' اسلام سے روگردانی اور سوشلزم کے فتوے عاید کر دینا آسان بھی ہوگا۔ اور صالحین کو اپنے اقتدار کی خاطر خانہ جنگی کی بھٹی میں جھونک دینا عین حکمت عملی بھی۔ رہا، جماعت کی جنگجو طاقت اقلیت کا مسئلہ "نزاد لا" تو جماعت کے صاحبان اقتدار کا اپنا مسئلہ اس لئے نہیں تھا کہ انہیں تو محض اپنے محلات میں بیٹھ کر حکمت عملی کو بروئے کار لانا تھا۔ اور اصل جنگی قوت کے لئے غازی اور شہید ہونے کا مرتبہ دلانا کام سے زیادہ انعام تھا۔ دوسری بات جو اس فورس کو ذہن نشین کرائی گئی تھی۔ اس کا اظہار بے حد کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے ایک "صالح ریوڑ" صاحب نے ابھی چند روز پیشتر یہ کیا ہے کہ جماعت کا ہر رکن دوسری سیاسی جماعتوں کے (کم از کم) پچیس اراکین کے برابر ثابت ہوگا۔ اور اب جو گذشتہ انتخابات نے اس عددی اقلیت کی حکمت عملی کے فلاپ ہو جانے کا ثبوت بہم پہنچا دیا ہے تو یہ امکان بعید از قیاس نہیں رہ جاتا کہ صف صالحین میں بھرتی کے اس "صالح سرخ فیتہ" پر نظر ثانی ہونا لازم قرار پا جائے۔

عوام پر اب یہ بات بھی پوشیدہ نہیں رہی کہ جماعت اسلامی کے نزدیک نظریۂ اسلام اور نظریۂ پاکستان کی تاویل در اصل سرمایہ دارانہ استحصال کو قائم و دائم رکھنے کی وہ خفیہ حکمت عملی تھی جس کا بھانڈا یوں پھوٹا کہ انہوں نے سرمایہ کاری اور سرمایہ داری کے موجودہ مراکز کے قومیانے کو آدھا اسلام ختم کر دینے کا درجہ دیا تھا اور اس طرح سے بالواسطہ طور پر مستقبل میں سرمایہ دارانہ استحصال کو جاری رکھنے کی ضمانت دے کر اس ہی سودی کاروبار کے پیسہ سے اپنے الیکشن کے اخراجات کی ایک حد بھی پوری کی تھی۔ لہٰذا آئندہ کھلم کھلا اس حکمت عملی کا پرچار بھی ختم ہو جائے گا۔ ایک اور متوقع تبدیلی جماعت کی رکنیت سازی کو عام کر دینے کے بعد عوامی سطح پر وہی حکمت عملی بروئے کار لائی جائے گی جس کا طعنہ آج بھٹو صاحب کو دیا جاتا ہے۔ اور جسے وہ اپنے الفاظ میں سستی جذبات انگیزی کا نام دیتے ہیں۔ یوں تو اسلام کے نام پر گذشتہ ۲۳ سالوں میں اس لائحہ عمل میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی ان سے اپنے جالوں میں رہ نہیں گئی تھی۔ لیکن اس کا دائرہ کار محض درمیانہ طبقہ کے پڑھے لکھے افراد تک محدود تھا۔ اور یہ تجربہ کر لینے کے بعد انٹیلکچوئل فورس پر بھروسہ کر کے غلطی کی تھی چنانچہ اب اس فورس کو نظر انداز تو شاید نہ کریں البتہ وقتی طور پر اصل کام عوامی سطح پر ہوگا۔ اس کی حکمت عملی اب یہ ہوگی

جماعت اسلامی
اپنے خزانہ
عامرہ میں
سوگنا اضافے
کی درخواست
دے گی

آزادیٔ صحافت والے کچھ مشورے صدر یحیٰی کو بھی دے کر دیکھیں

مسعدوں اور مزاروں والی "اکثریت" میں خفیہ اثر و نفوذ ہوگا۔ اس حکمت عملی کا دوسرا پہلو جماعت کی جنگجو قوت کو بھرپور طریقہ پر منظم کرنا ہوگا۔ تاکہ اسلام پسندانہ انقلاب لانے کی بنیادی شرط پوری ہو سکے۔

گذشتہ دنوں (قومی اور صوبائی) انتخابات میں جماعت کی ناکامی کی وجوہات اب تک جماعت اسلامی کے مدبرین سے لے کر صالحین تک گنا تے رہے ہیں وہ یوں ہیں :۔

ا - پاکستانی عوام کا ناپختہ شعور

اا - اسلام پسند (جماعت اسلامی خود اس سے مستثنیٰ ہے) کے درمیان نفاق۔

ااا - انتخابات میں پیپلز پارٹی (یاد رہے صرف پیپلز پارٹی) کی دھاندلیاں

۱۷ - بھٹو کا لوگوں کو سستے نعروں سے ورغلانا۔

ان وجوہات میں "زندگی" کے شمارہ - ۱۴ - ۲۰ دسمبر میں "سفلی جمہوریت سے ملکوتی جمہوریت تک" والے مضمون میں ایک جماعتی دانشور نے اپنے مربیوں کی مندرجہ ذیل دشواریاں بھی گنوائی ہیں۔

ا - "جمہوریت میں عوام کا فیصلہ ہمیشہ معقولیت میں نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات نامعقولیت غالب آجاتی ہے۔"

اا "ہمیں یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ مسٹر بھٹو کی شخصیت میں پسماندہ سیاسی شعور کو متاثر کرنے کے لئے یہ طلسم ذکر موجود تھا اور اس نے سندھ و پنجاب کو متاثر کر لیا۔"

ااا - "یہ بھی بات تسلیم کرنی ہوگی کہ سیاسی قائدین میں کوئی بھی مسٹر بھٹو کی طرح حرکت اور توانائی کی صفات نہیں رکھتا۔"

۱۷ - "انتخابات جیتنے کے لئے سرمائے کی قوت بھی ضروری ہوتی ہے اور مسٹر بھٹو کی پیپلز پارٹی سرمائے کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔"

(۷) "مسٹر بھٹو کی کامیابی کی وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے ہر جگہ اپنے آپ کو اسلام پسند کی حیثیت میں پیش کیا۔"

۷ا - "بھٹو کی کامیابی کا اصل "راز" اس میں پوشیدہ ہے کہ ان کی پارٹی صرف پنجاب اور سندھ میں تھی یا تھوڑی سی صوبۂ سرحد میں ورنہ مشرقی پاکستان بلوچستان اور قبائلی علاقوں میں اس پارٹی کا وجود ہی نہیں تھا۔"

ان دس گیارہ وجوہاتِ ناکامی کو سمجھ لینے

انتخابات ہارنے کے بعد بے نیازی کا اظہار جھینپ مٹانے کے مترادف ہے

کے بعد جماعت اسلامی کو اپنی پوری سیاسی حکمت عملی کو بدلنا ہوگا اور اپنے ان موودو دیئے دانشور کی درپردہ نصیحتوں کو گرہ میں باندھ کر اب جماعت کو

(ا) نوجوان قیادت کو برسر اقتدار لانا ہوگا۔

(اا) لوگوں کے سفلی جذبات کو بھڑکانے کی مشق کرنا ہوگی۔

(ااا) آئندہ کو اپنے خزانۂ عامرہ میں سو گنا اضافے کی درخواست دینا ہوگی۔

(۱۷) جماعت کے دائرہ کو صرف پنجاب اور سندھ تک محدود کرنا ہوگا۔

(۷) حسب ضرورت اپنے آپ کو جمہوریت کے متوقع کامیاب رائج الوقت طریقوں کو معقولیت یا نامعقولیت میں ڈھالنا ہوگا تاکہ حسب خواہش غالب آیا جا سکے۔ اور مزید تاکہ آئندہ کسی الیکشن میں موجودہ طرز پر اپنے ایجر پنجر کا سرمہ بنائے جانے سے بچایا جا سکے۔

ان دس گیارہ وجوہاتِ ناکامی کو سمجھ لینے کے بعد مزید ظاہر ہے کہ امیر جماعت اسلامی اپنے اراکین تابعین اور اپنے پیروکاروں کو کس قسم کا جدید پروگرام دے سکتے ہیں۔ اس کا خاکہ ہم عرض کر چکے ہیں۔ لیکن اس خاکہ میں رنگ آمیزی کے لئے کچھ اور بھی کرنا ہوگا تاکہ اس "خاکہ" کو کامیاب بنانے کے لئے اردگرد کی فضا بھی سازگار ہو سکے۔

انتخابات سے اب تک اسلام پسند اخباروں اور جریدوں نے جو قلابازی کھائی ہے وہ "راست گوئی" اور "اعلائے کلمۃ الحق" کا وہ "بے مثال" نمونہ ہے جو ہمیں منصورِ حلاج کی یاد دلاتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں "بھٹو —— امریکی ایجنٹ" اور "مکس اپ" کرنے والی باتوں کے خلاف گذشتہ دنوں "اسلام پسند" موقر جرائد میں بھٹو کو ان کی عاقبت کے سلسلے میں جو جو مشورے اور دھمکیاں دی گئی ہیں ان سے اسلام پسندوں کے "مارنے اور مرجانے والے" جارحانہ عزائم کی صاف صاف نشاندہی ہو جاتی ہے۔ ایک اور بات قابل توجہ یہ ہے کہ ۹ دسمبر ہی سے نہ جانے بھٹو کے عوام سے کئے گئے وعدوں کی فکر ان لوگوں کو شدید مرض کی طرح لاحق ہو گئی ہے۔ اور "جسارت" اور "زندگی" جیسے اخبار و رسائل میں صرف اسی ایک ہی مضمون کو سو سو طرح باندھا جا رہا ہے۔

بظاہر ان دونوں باتوں میں بڑی محب وطن اور محب عوام قسم کی پالیسی نظر آتی ہے اور حزب اختلاف کا یہ نیک اور دانشمندانہ فریضہ بھی ہوتا ہے کہ وہ برسر اقتدار طبقہ کو اس قسم کی یاد دہانی کراتی رہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے بھی اس طرف اشارہ

باقی صفحہ ۴۳ پر

مظفر عبّاس

لامساوی نظاموں کی دنیا

میں اب تک تو اس سوچ سے بے رُخی سی برتتا تھا
پر آج کیوں ؟
آج کیوں میری سوچوں کے
گھرے، گھنیرے، اُداس اور آوارہ بادل
میرے ذہن کی کچّی کُٹیا کی چھت پر
گراتے ہیں پانی کی یخ بستہ بوندیں
میری قوّتِ باصرہ بھی،
میری سوچ کی باہوں میں باہیں ڈالے ہوئے چل رہی ہے
میں یہ دیکھتا ہُوں
میں یہ سوچتا ہُوں
کہ سرسبز کھیتوں کی صاف اور ٹیڑھی سی پگڈنڈیوں پر
یہ بوسیدہ کپڑوں، سیاہ چمڑیوں والے کمزور بوڑھے،
یہ کھیت اور فصلیں، درخت اور پودے،
انہی کے پسینے کی جلوہ گری ہیں۔

تو پھر کیوں یہ بوڑھے، یہ بے بس، یہ بے کس
ترستے ہیں نانِ شبینہ کو اکثر
اِنہی کا پسینہ مِلوں کو چلاتا ہے، دھرتی کی رگ رگ میں،
خوُن اِن کا گردش میں رہتا ہے
پھر کیوں یہ دھرتی کے راکھی، مِلوں کے نگہبان،
ہمیشہ ترستے ہیں نانِ جویں کو
خداوند تیرے کہ یہاں سب مساوی ہیں
پھر اس جہاں میں
تیری بادشاہت کے منصف، مساوی وسیع دائرے میں
لامساوی نظاموں کے پُرپیچ اور بے عمل سِلسلے کیوں؟
خداوند تُو تو کریم و حکیم و غفور و رحیم اور قہّار بھی ہے
تو اب تک نہ کیوں قہر تیرا،
لامساوی نظاموں کی دُنیا پہ ٹوٹا ......؟

پولینڈ میں سوشل سامراج کے تسلط کے خلاف مزدوروں کی جدوجہد

وہاب صدیقی

"روٹی کپڑا دو۔"
"ہم آزادی چاہتے ہیں۔"
"گوملکا مردہ باد۔"

۱۴ دسمبر ۷۰ء کو شپ یارڈ کے مزدور دانسک ریڈیو اسٹیشن کے باہر کھڑے یہ نعرے لگا رہے تھے، جو ہاتھ کل تک جہاز سازی میں مصروف تھے وہ آج ہوا میں لہرا رہے تھے اور اس عزم کا اظہار کر رہے تھے کہ وہ مزید سوشل سامراجیوں کے استحصال کا نشانہ نہیں بنیں گے۔ یہ محنت کش ریڈیو حکام سے مطالبہ کر رہے تھے کہ وہ مہنگائی کے خلاف مزدوروں کا ردِ عمل اور ان کے جائز مطالبات نشر کریں لیکن ریڈیو کے حکام طبقاتی ریاست کا ایک جزو ہونے کی وجہ سے لامحالہ حکمران طبقے کے ہمنوا تھے اس لئے وہ مزدوروں کے مطالبات نشر کرنے سے قاصر تھے۔

مزدوروں کو مظاہرہ کرتے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ پولش ملیشیا نے ریڈیو اسٹیشن اور مزدوروں کو گھیرے میں لے لیا۔ پھر پولینڈ کے اس شہر میں ملیشیا نے وہی قصہ دہرایا جو سامراجی اور سوشل سامراجی ریاستوں کی پولیس اور فوج کا وطیرہ ہے۔ مزدوروں کے اس ہجوم کو منتشر کرنے کے لئے گولیوں کی باڑھ ماری گئی، آنسو گیس چھوڑی گئی اور لاٹھی چارج کیا گیا۔ چند لمحوں بعد ریڈیو اسٹیشن کے باہر چھ لاشوں اور ۱۱۵ سسکتے ہوئے زخمیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

شپ یارڈ کے مزدوروں کا یہ مظاہرہ پولینڈ کی وزراء کی کونسل کے اس فیصلہ کا ردِ عمل تھا جس کے تحت ۴۶ اشیاء صرف کی قیمتوں میں اضافہ کیا گیا تھا۔ یہ فیصلہ ۱۲ دسمبر کو ہوا تھا۔ اس کے اگلے دن ہی روزمرہ کے استعمال کی اشیاء کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی تھیں۔ گوشت کے نرخ میں ۶ء۱۷ فیصد، آٹے میں ۱۶ فی صد دودھ میں ۸ فیصد، سوتی اور اونی پارچہ جات میں ۵ء۱۴ فیصد، کوئلے میں ۱۰ تا ۱۴ فیصد اور کافی میں ۱ء۹۲ فیصد اضافہ ہوا تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اشیائے صرف کے نرخوں میں مجموعی طور پر ۲۰ فیصد کا اضافہ ہوا تھا۔

مہنگائی کے خلاف سب سے پہلے دانسک کے شپ یارڈ کے مزدوروں نے آواز اٹھائی جسے سختی سے کچل دیا گیا۔ لیکن دوسرے ہی دن یعنی ۱۵ دسمبر کو پھر ایک ہجوم دانسک ریڈیو اسٹیشن کے باہر جمع ہو گیا۔ یہ صرف مزدوروں کا ہی ہجوم نہ تھا بلکہ پولی ٹیکنک یونیورسٹی کے طلبہ بھی اپنا روایتی اور انقلابی کردار ادا کرنے کے لئے محنت کشوں میں شامل ہو گئے تھے۔ اس دن وہ ریڈیو اسٹیشن کا گھیراؤ کرنے کے علاوہ ٹراموں کی پٹڑیوں پر دھرنا دے کر بیٹھ گئے۔ ریل کا پہیہ جام کر دیا۔ سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ صوبائی کمیونسٹ پارٹی کے دفتر کو نذرِ آتش کر دیا اور سرکاری عمارتوں پر سنگ باری کی۔ اس دن بھی پولش ملیشیاء نے ظلم و تشدد سے کام لے کر عوام کی آواز کو دبانا چاہا۔ حکومت نے مہنگائی کم کرنے کی بجائے مظاہرہ کرنے والوں کو "غنڈوں اور مہم پسند" کے خطابات سے نوازا لیکن حق نہ آج تک دبا ہے اور نہ کوئی اسے مٹا سکا ہے۔ دانسک کے محنت کشوں کی آواز بھی پولینڈ کی سوشل سامراجی حکومت دبا نہ سکی اور اس آواز نے دوسرے شہروں کے عوام کو بھی خواب غفلت سے بیدار کر دیا۔ دانسک کے فوراً بعد شمالی پولینڈ کے گوئٹیا، سوپوٹ اور دوسرے شہروں کی سڑکوں گلیوں اور کوچوں میں مظاہرے شروع ہو گئے۔

گوملکا کی حکومت نے ان شہروں کا مواصلاتی رابطہ بیرونی دنیا سے منقطع کر دیا تاکہ عوام دوست طاقتوں کو پولینڈ میں کھیلے جانے والے اس گھناؤنے عوام دشمن اور سوشل سامراجی ڈرامے کا پتہ نہ چلے، فضائی سروس بند کر دی اور ان شہروں کو فوج کے حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھ سوویت یونین کے ترمیم پسند حکمران طبقے نے پولینڈ کے حکمران ٹولے کو بچانے کے لئے اپنی فوجوں کو تیار رہنے کا حکم دیا۔ اور ہزاروں روسی فوجیوں نے پولینڈ کی سرحد پر جنگی مشق شروع کر دی۔ تاکہ اشارہ ملتے ہی پولینڈ میں بھی چیکوسلواکیہ کا قصہ دہرایا جائے۔

پولینڈ کی فوج نے عوامی تحریک کو دبانے کے لئے کرفیو نافذ کیا جسے عوام نے بار بار توڑا۔ اور فوج کے تمام قوانین کی خلاف ورزی کی۔ فوج اور عوام کے اس تصادم میں دس ہزار افراد ہلاک اور لاتعداد زخمی ہوئے۔ اس بات کا اعتراف پولینڈ کے وزیرِ اعظم نے ۱۷ دسمبر کو ٹیلی ویژن سے تقریر کرتے ہوئے کیا تھا۔ لیکن ظلم پھر ظلم ہے۔ بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ محنت کشوں کے مقابلے میں پولینڈ کے حکمرانوں کو شکست قبول کرنا پڑی۔ پولینڈ کی کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری مسٹر ولادیا سلاف گوملکا پولینڈ کے صدر مارشل ماریان اسپائی چالسکی اور وزیرِ اعظم مستعفی ہو گئے۔ اور عنانِ حکومت کمیونسٹ پارٹی کے نئے سیکرٹری ایڈورڈ جیرک نے سنبھال لی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ عوامی مظاہرے کیں

الفتح

صرف مہنگائی کا ردِ عمل تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ مظاہرے صرف مہنگائی کے پیدا کردہ نہ تھے بلکہ جو لاوا برسوں سے اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ مہنگائی کی وجہ سے وہ پھٹ پڑا اور اپنے ریلے میں حکمران ٹولے کو بہالے گیا۔

پولینڈ بنیادی طور پر زرعی ملک ہے۔ ۱۹۴۵ء میں پولینڈ کی پرولتاریہ اتنی منظم نہ تھی کہ وہ انقلاب کی قیادت کا مقدس فریضہ جو اسے تاریخ نے سونپا ہے، انجام دیتی، چنانچہ جنگِ عظیم دوم کے بعد ۱۹۴۵ء میں جب پولینڈ سوویت یونین کے حلقۂ اثر میں آیا اور اس کے نتیجے میں جو اشتراکی نظام قائم ہوا وہ پولینڈ کی پرولتاریہ کی جدوجہد کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پولینڈ میں انقلاب درآمد کیا گیا تھا۔ اس انقلاب کے بعد جو قیادت ملک پر مسلط ہوئی وہ سوشلسٹ نظام سے اتنی مخلص نہ تھی جس کی وجہ سے پولینڈ میں پرولتاریہ کی آمریت قائم نہ ہو سکی اور بورژوا طبقہ محرومِ اقتدار ہونے کے باوجود ریاست کو اپنی گرفت میں لئے رہا۔ اور انقلاب کی راہ میں مزاحمت کرتا رہا۔ پرولتاریہ کی اور بورژوا کی یہ جدوجہد ابھی جاری تھی کہ جوزف اسٹالین کی موت کے بعد سوشلسٹ دشمن مارشل بلگانن اور خروشچیف سوویت یونین کے سیاسی افق پر نمودار ہوئے اور سوویت یونین میں ترمیم پسندی کی بنیاد ڈالی۔ نتیجتاً پولینڈ بھی اس سے متاثر ہوا۔ یہاں کا بورژوا طبقہ ابھی طاقتور تھا اس لئے اس نے پرولتاریہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سرمایہ داری کی بحالی کی کوششیں شروع کر دیں۔ نتیجتاً پرولتاریہ نے مزاحمت کی اور ۱۹۵۶ء میں زبردست مظاہرے ہوئے۔ قیادت تبدیل ہوئی لیکن یہ قیادت بھی پرولتاریہ کی نہیں تھی، ترمیم پسندوں کی تھی جو سرمایہ داری کا احیاء چاہتے تھے۔ حکمران طبقے کو سوویت یونین کی حمایت حاصل تھی بلکہ روس پولینڈ کو اپنی نوآبادی سمجھتے ہوئے استحصال کر رہا تھا۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ ترمیم پسند ہی اس ملک کے قائد رہیں۔ اس لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے پولینڈ کی پیداوار روز بروز گرتی گئی۔ طلب و رسد کا توازن بگڑ گیا۔ معاشی بحران پیدا ہوا۔ مہنگائی بڑھی۔ بے چینی [illegible] پھیلایا اور پھر محنت کش اور طلبا اپنے حقوق کے لئے سڑکوں پر نکل آئے۔

پولینڈ کے عوام کی حالیہ جدوجہد نے سوشل سامراجی نظام پر زبردست چوٹ لگائی ہے۔ اپنی جدوجہد کا پہلا مرحلہ انہوں نے بڑی کامیابی سے طے کیا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے نئے سیکرٹری مسٹر ایڈورڈ جیرک بھی سوویت یونین کے ہمنوا ہیں۔ انہوں نے ٹیلی وژن کی تقریر میں عوام کو دھوکا دینے کے لئے چند کھوکھلے وعدے کئے ہیں اور سوویت یونین کو اپنے تعاون کا یقین دلایا ہے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے کہا ہے کہ وہ "نظم و نسق کو ہر حال میں برقرار رکھیں گے اور اس کی خلاف ورزی برداشت نہیں کی جائے گی۔" اس تقریر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسٹر جیرک بھی اپنے پیش رو کی طرح ترمیم پسندانہ پالیسی اپنانے اور عوام کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ لیکن پولینڈ کے عوام اب متحد ہو رہے ہیں اور وہ اپنے ملک کو سوشل سامراجیوں کے چنگل سے یقیناً آزاد کرا لیں گے۔

بقیہ :- نیا سال

بلند کی۔

لیکن سال کا آخری حصہ عوامی خواہشات کی کامیابیوں کا سال تھا۔ اور اس کامیابی نے پورے سال کے ابتدائی اور وسطی حصے میں رجعت پسندوں کی کامیابی کے لئے انجام دیئے جانے والے کارناموں "کو پس پردہ پھینک دیا تھا۔ ۷ دسمبر اور ۱۷ دسمبر کے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات سے عوام نے رجعت پسندوں کے نام نہاد فتووں، حکمران طبقے کے اہل کاروں کی سازشوں اور سامراج پسندی کو یکسر مسترد کر دیا۔ سال بھر اپنی متوقع فتح کے شادیانے بجانے والوں کو گمنامی کے گوشوں میں پھینک دیا۔ اور اس طرح انھوں نے اپنی اس سوچ کا اظہار کر دیا کہ وہ اپنے روٹی کپڑے اور مکان کے بکھرے ہوئے مسائل کو حل کرنے کے لئے کس راستے کو پسند کرتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ۲۳ سال سے استحصال کی چکی میں پسنے والوں نے ردِ عمل کے طور پر مجیب کو اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا جبکہ مغربی پاکستان کے عوام نے مزدوروں اور کسانوں کو صنعتوں اور زمینوں میں مساوی حصہ دینے کا نعرہ لگانے والے بھٹو کو اپنے سروں پر بٹھا لیا۔

رخصت ہونے والے پرانے سال نے نئے سال کو تحفے میں خوش کن آرزوئیں اور تمنائیں دی ہیں — ۱۹۷۱ء کا نیا سال ان آرزوؤں اور امنگوں کا کس طرح استقبال کرتا ہے اور کیونکر انہیں عمل کی کسوٹی پہ پورا کرنے کے لئے تیار ہے؟ یہ خود اس کے آنے والے لمحات ہمیں بتائیں گے۔ ع

دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

۸ ، جنوری کی طلباء کی تحریک کی کہانی

جدوجہد کی تاریخ طلباء کے خون سے رنگین رہیگی

انجم جاوید صابری

طلبہ نے پاکستان میں اپنے خون سے جدوجہد کی انمٹ داستانیں لکھی ہیں ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۹۶۹ء تک متعدد بار کراچی کی سڑکوں کو اپنے خون سے لالہ زار کیا ہے۔ لاٹھیوں، گولیوں اور آنسو گیس کو اپنے نعروں سینوں اور آنکھوں پر سہا ہے۔ اپنے سامراج دشمن نعروں سے امریکہ پسندوں اور سرمایہ داروں کے دل دہلائے ہیں۔ آمروں کے خلاف آوازیں بلند کر کے برسوں کے سناٹوں کا طلسم توڑا ہے۔ ایوب خان کے مارشل لاء کے خلاف پہلی آواز طلبہ کی تھی۔ اور دس سالہ آمریت کے خلاف پہلا پتھر بھی انہیں کا پھینکا ہوا تھا۔ جدوجہد کی یہ مشعل نوجوانوں نے ہمیشہ اپنے خون سے روشن رکھی ہے جدوجہد کی پوری تاریخ متاع جان لٹا دینے والے طلبہ کے خون سے رنگین رہے گی اور ۸، جنوری ۵۳ء کے وہ شہداء ان میں ہمیشہ ممتاز رہیں گے۔ جنہوں نے پاکستان میں عوامی جدوجہد کا پہلا باب تحریر کیا تھا ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ جنہوں نے لاٹھی گولی کی سرکار پر کاری ضرب لگائی تھی۔

۱۹۵۳ء تک کراچی میں طلباء کی کوئی تنظیم وجود میں نہ آسکی تھی۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ کراچی کے طلباء کے سامنے کوئی مسائل نہیں تھے یا انہیں تنظیم کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ بات محض یہ تھی کہ حصول پاکستان نے عوام کے جذبات کو ایک نقطہ عروج پر پہونچا دیا تھا۔ جس میں ہر چیز کو ایک بیرونی خاکے کی شکل میں تو دیکھا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کی ذہنی اور طبعی ہیئت کا بغور مطالعہ ممکن نہ تھا۔ البتہ کراچی کے طلبہ کو اپنے مسائل کا غیر مرئی سا احساس ہونے لگا تھا۔ مگر ان مسائل کو حل کرنے کے لئے جن سنخرے احساسات کی ضرورت ہوتی ہے وہ یکسر مفقود تھے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی کے ایک طالب علم نے آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن والے تجربات کو یکجا و مجتمع کر کے ایک جماعت کی داغ بیل ڈالی۔ ہندوستان میں بارہا تحریکات میں حصہ لینے اور متعدد بار تحریکات کو منظم کرنے کے قابل قدر تجربہ کے باوجود وہ صاحب طلباء کو منظم کرنے میں ناکام رہے۔ اور اس طرح ان کی جماعت کی موت واقع ہو گئی۔ اس جماعت کی چند روزہ زندگی سے کم از کم کراچی کے طلباء کے دلوں پر سے کارکردگی کا خوف اور مقابلے کا ہراس کسی حد تک چھٹ گیا۔ اس جماعت کے خاتمے کے بعد ڈی جے سائنس کالج کے طلباء نے میڈیکل کالج کے کچھ طلباء کو ساتھ لے کر ڈیمو کریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی۔ اپنے تجربات و مشاہدات اور پیش رو جماعت کی خوبیوں اور خامیوں سے استفادہ کے باوجود ۱۹۵۲ء کے وسط تک اس گروہ کی کوششیں کوئی قطعی جماعتی صورت اختیار نہ کر پائیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میڈیکل کالج کے طلباء وزارت صحت کے رویئے کے خلاف آواز اٹھانا چاہتے تھے۔ جو اس نے ڈاؤ میڈیکل کالج سے پاس ہونے والے ڈاکٹروں کے سلسلہ میں اختیار کر رکھا تھا۔ میڈیکل کالج کے علاوہ کراچی کے دیگر طلباء میں بھی وزارت صحت کے اس رویہ کے خلاف بے چینی پائی جاتی تھی۔ ڈی ایس ایف کے مٹھی بھر کارکنوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے پچھلے تجربات کی روشنی میں تمام ذرائع کو بروئے کار لا کر میڈیکل کالج کے طالب علموں کو یکجا کیا اور ایک منظم ہڑتال پر آمادہ کیا۔ اس دور میں کچھ قابل قدر طلباء عام صفوں میں سے ابھر کر آئے۔ جنھوں نے آگے چل کر مشہور و معروف جنوری تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔

میڈیکل کالج کی اس کامیاب ہڑتال کے بعد ڈی ایس ایف کے مذکورہ کارکنوں نے وسیع پیمانے پر جماعتی تنظیم شروع کر دی۔ کچھ عرصے بعد ہی اس جماعت کی رکنیت ۳ ہزار سے تجاوز کر گئی۔ اگست ۱۹۵۲ء میں اس کا کونسل سیشن منعقد ہوا۔ جس میں کراچی کے طلباء کی جانب سے مختلف مطالبات پر مشتمل ایک یادداشت تیار کی گئی۔ اس یادداشت پر کارکنوں نے کراچی کے ہر کالج اور ہر اسکول میں طلباء سے دستخط کرائے اور اس طرح پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار طلباء نے اپنے مطالبات کو ایک شکل دے کر ان کے منوانے کے طریقۂ کار پر غور کیا۔

ڈی ایس ایف کے چند کارکنوں نے اس امر کو زیادہ مناسب سمجھا کہ مطالبات نامہ پر اگر ایک جماعتی پلیٹ فارم کے بجائے نسبتاً زیادہ وسیع پلیٹ فارم پر کام کیا جائے تو کہیں بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں چنانچہ تمام کالجوں کے نائب صدر اور جنرل سیکریٹریوں کا اجلاس طلب کر کے انٹر کالجیٹ باڈی (آئی سی بی)

اے بی اے حلیم نے تحریک کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی تھی

کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا۔ آئی سی بی نے ایس ایم کالج کے نائب صدر اقبال احمد پروانہ کے زیر صدارت ایک ایکشن کمیٹی تشکیل کی۔ جس نے ایک اعلان کے ذریعہ ۸ر جنوری ۱۹۵۳ء کو یوم مطالبات منانے اور ایک عام ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا۔ آئی سی بی کے اس اعلان پر کراچی کی مختلف جماعتوں نے لبیک کہا، لیکن چند رجعت پسند جماعتوں نے طلباء کے مفادات سے غداری کی روایات کو برقرار رکھا اور اس اعلان سے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ ان جماعتوں کی سرغنہ اسلامی جمعیت طلباء تھی۔ جماعت اسلامی کی اس بغل بچہ تنظیم کے علاوہ اگر کسی اور کو اس یوم مطالبات سے پریشانی لاحق تھی تو وہ پروفیسر اے بی اے حلیم وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی تھے۔ مسلم لیگی ذہنیت کے ان بزرگ کو جنہیں اپنے بدیسی آقاؤں سے بڑی محبت تھی کسی قیمت پر یہ منظور نہ تھا کہ ان کی ماجد عانی میں کسی قسم کا کوئی غلغلہ ہو۔ حلیم صاحب اپنے اس خیال میں اس قدر محو تھے کہ برس ہا برس کے تجربات کو بالائے طاق رکھ کر وہ ایک ایسی غلطی کر گئے جو عام حالات میں شاید وہ کبھی نہ کرتے۔ اور جس کے نتیجے کے طور پر انہیں آج تک طلباء برادری کے ایک خطرناک اور بدترین دشمن کی حیثیت حاصل ہے۔

۶ر جنوری ۱۹۵۳ء کی سہ پہر حلیم صاحب بنفس نفیس اپنے چند خوشامدی طالب علموں کا ایک وفد وزیر تعلیم فضل الرحمٰن کے پاس لے گئے۔ جہاں انہوں نے وزیر تعلیم سے طلباء کی مشکلات پر تبادلۂ خیال کیا۔ وزیر تعلیم کے ضروری وعدوں اور یقین دہانیوں کے بعد انہوں نے "ڈان" میں خبر شائع کروادی کہ وزیر تعلیم نے وائس چانسلر کی موجودگی میں طلباء کے مطالبات مان لینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ ۸ر جنوری کی صبح کو "ڈان" کے چوتھے صفحے والی اس ڈیڑھ کالمی خبر نے آگ پر تیل کا کام کیا اور طلباء کے جذبات کی آگ اس بری طرح بھڑک اٹھی کہ خواجہ ناظم الدین کی حکومت کے ساتھ حلیم صاحب کا سکون و چین بھی اس میں بھسم ہو گیا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی وائس چانسلری پر ان کے درون خانہ تعلقات کے باعث ۱۹۵۷ء تک کوئی حرف نہ آسکا۔

۷ر جنوری کو کراچی کے تمام کالجوں میں ہڑتال رہی۔ اسی روز ڈی جے کالج کے کمپاؤنڈ میں جو جلسۂ

۸ جنوری کی تحریک کے مطالبات

۱۔ ڈاؤ میڈیکل کالج کی ایم بی بی ایس کی ڈگری تسلیم کی جائے۔

۲: چھ ماہ کی یکمشت فیس وصول کرنے کے بجائے ایک ماہ کی فیس لی جائے۔

۳: فیسوں میں ۳۳ فیصد کمی کی جائے۔

۴: تعلیمی اداروں میں اضافہ کیا جائے۔

۵: اقامت گاہوں میں اضافہ کیا جائے۔

۶: اردو کالج اور اسلامیہ کالج میں نائٹ کلاسز کو بند کرنے کا حکم واپس لیا جائے۔

۷: غریب اور مستحق طلبہ کو حکومت وظیفے اور مالی امداد دے۔

۸: دستور میں ملک کے نوجوانوں کے حقوق کی ضمانت دی جائے۔

۹: فری اسکالرشپ پانے والے طلباء سے یونیورسٹی کے امتحانات کی فیس نہ لی جائے۔

۱۰: بورڈ اور یونیورسٹی کے عام امتحانات کے بعد ضمنی امتحانات کا طریقہ رائج کیا جائے۔

عام منعقد ہوا اس نے ناظم الدین کی حکومت اور کراچی انتظامیہ کی طرف سے بھیجے ہوئے سینکڑوں بکتربند سپاہیوں اور "ڈان" کی آتش فشاں خبر سے مشتعل ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ طلباء کا ایک وفد فضل الرحمٰن کی کوٹھی پر لے جایا جائے اور وہاں ان کے سامنے اپنے مطالبات پیش کیے جائیں۔

جلسۂ عام میں وائس چانسلر کے رویے کے خلاف بھی ایک قرارداد پاس کی گئی۔ متعدد قراردادیں پاس کرنے کے بعد طلباء ایک جلوس کی شکل میں کالج کمپاؤنڈ سے باہر آگئے۔ پولیس نے جلوس روکنے کی کوشش میں ہلکا سا لاٹھی چارج بھی کیا۔ لیکن طلباء کا طوفان لاٹھی چارج سے نہ دب سکا۔ اور بندر روڈ سے ہوتا ہوا صدر کی جانب نکل پڑا۔ ڈی جے کالج سے وکٹوریہ روڈ کے چوراہے تک پولیس لاٹھی چارج کرنے، اس میں شدت پیدا کرنے اور جلوس کا راستہ روکنے تک سارے حربے استعمال کر چکی تھی۔ اس لئے دوسرا قدم لازمی طور پر اشک آور گیس کا استعمال تھا۔ اشک آور گیس اور دونوں طرف سے مسلح پولیس سے گھرا ہوا یہ جلوس الفنسٹن اسٹریٹ پر پہنچ گیا جہاں اسے کلارک اسٹریٹ کے چوراہے پر اشک آور گیس کی باقاعدہ بوچھاڑ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ طلباء پولیس کے رویہ کی وجہ سے ناظم الدین حکومت کے خلاف نفرت کا اظہار کرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ سمرسٹ ہاؤس کے پیچھے میاں افتخار الدین نے اپنی کار کی چھت پر کھڑے ہو کر اس جلوس سے خطاب کیا۔ میاں افتخار الدین اس وقت حزب اختلاف کے رہنما تھے اور بائیں بازو کے حلقوں میں کافی احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ انہوں نے یقین دلایا کہ دستور ساز اسمبلی میں ہم حکومت کو آڑے ہاتھوں لیں گے۔ میاں صاحب کی اس یقین دہانی کے بعد طلباء کے جوش و خروش اور خود اعتمادی میں اور اضافہ ہو گیا۔ بالآخر طلباء وزیر تعلیم فضل الرحمٰن کی کوٹھی پر پہنچ ہی گئے۔ وہاں پولیس نے تمام طلباء لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ طلباء نے اعلان کیا کہ جب تک ایک ایک طالب علم کو رہا نہیں کر دیا جاتا طلباء فضل الرحمٰن سے نہیں ملیں گے۔

ڈی جے کالج سے وزیر تعلیم کی کوٹھی تک اپنی پے در پے شکستوں اور ناکامیوں کی بنا پر نقوی صاحب (سابق کمشنر کراچی) اور ان کی پولیس کو احساس ہو گیا کہ وہ طلباء کی ہمتوں کو اشک آور گیس کی مدد سے

طلباء نے گورسانی کی کار کو آگ لگادی

نہیں دبا سکتے۔ اس لئے پولیس کو تمام گرفتار شدہ طلباء کو فوراً رہا کرنا پڑا۔ طلباء کے جوش و خروش اور خود فراموشی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس دوران میں مشرقی پاکستان کے وزیر اعلےٰ مسٹر نورالامین اس طرف آنکلے اور فضل الرحمٰن سے ہم حلیہ ہونے کے قصور میں ناحق طلباء کی توجہ کا شکار ہوئے طلباء نے اشک آور گیس کے شیل فضل الرحمٰن کی کوٹھی میں پھینکنے شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ وہ طلباء کے نمائندوں سے گفتگو کرنے پر رضامند ہو گئے۔ طلباء کے ایک رہنما نے پولیس وین کے لاؤڈ اسپیکر سے طلباء کو خطاب کرتے ہوئے منظم اور متحد رہنے کی ہدایت دی۔ چونکہ دن ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس لئے مناسب یہی سمجھا گیا کہ آئی سی پی کے عہدیداران وزیر تعلیم سے گفتگو کرنے کے لئے ٹھہر جائیں اور باقی طلباء کل ملاقات کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے دوبارہ ڈی جے کالج کے احاطے میں جمع ہو جائیں۔

۸ر جنوری کی صبح اسلامی جمعیت طلباء کے ایک پمفلٹ سے طلوع ہوئی۔ یہ ایک انتہائی مضحکہ خیز پمفلٹ تھا۔ اس کا عنوان تھا "جمعیت کے کارکنوں پر آنسو گیس پھینکی گئی۔" حالانکہ یہ بالکل جھوٹی اور بے بنیاد خبر تھی۔ ۸ر جنوری کی صبح اس مضحکہ خیز ہینڈ بل کے ساتھ دوسری چیز اپنے ہمراہ لائی۔ وہ ہارون گروپ کا "ڈان" اخبار تھا۔ ڈان نے چوتھے صفحے پر ایک کالمی سرخی لگا کر خبر دی کہ وزیر تعلیم نے طلباء کے ایک وفد سے ملاقات کی اور ان کے مطالبات تسلیم کر لئے۔ حالانکہ یہ بالکل جھوٹی خبر تھی۔ طلباء نے اس جھوٹ کا بدلہ پوری طرح لیا۔ ہر گلی اور ہر چوراہے اور ہاکروں کی دکان کے سامنے ہزاروں کی تعداد میں ڈان اخبار جلنے لگے۔ ڈی جے کالج میں جمع ہونے والے طلبہ نے بطور احتجاج ایک جلوس نکالا۔ جو ۷ جنوری سے کئی گنا بڑا تھا۔ منتظمین جلوس کا رخ بندر روڈ لائٹ ہاؤس سینما سے مولوی مسافر خانے کی طرف موڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب یہ جلوس ریڈیو پاکستان پہنچا تو نعروں میں بہت تیزی آ گئی تھی۔ لیکن جلوس کو اب پرنس روڈ پر موڑ لیا گیا۔ جب جلوس فریئر روڈ پر صدر کی طرف مڑا تو اس کی صورت Z کی طرح ہو گئی۔ یعنی اس کا ایک سرا فریئر روڈ پر درمیانی حصہ پرنس روڈ پر اور دوسرا بندر روڈ پر ہو گیا۔ فریئر روڈ سے جب یہ جلوس وکٹوریہ روڈ کی طرف مڑا تو جلوس پر پولیس نے بے تحاشا آنسو گیس کے گولے برسانے شروع کر دیئے۔ یہ گیس گذشتہ دنوں کے مقابلے میں زیادہ شدید اور تیز تھی۔ جلوس میں اسکول کے بچوں کی بھی بہت بڑی تعداد شریک تھی۔ لہٰذا کئی گھنٹے لڑکے وکٹوریہ روڈ پر بوھری بازار اور الفنسٹن اسٹریٹ کی دکانوں اور مکانوں میں پناہ لیتے رہے اور موقع پاتے ہی بوھری بازار میں جمع شدہ سڑک بنانے والے پتھروں سے پولیس پر پتھراؤ کرنے لگتے پولیس والوں نے اپنا سب سے بڑا مورچہ پیراڈائز سینما کے چوراہے پر بنا رکھا تھا۔ جلوس پر اشک آور گیس کے پہلے حملے کے وقت جلوس کا ٹکڑا گیس کے دھوئیں سے بچنے کے لئے وکٹوریہ روڈ اور الفنسٹن اسٹریٹ کے اگلے نصف حصوں پر نکل آیا تھا۔ اور بقیہ بڑا حصہ بوھری بازار کی گلیوں میں گھٹ کر رہ گیا تھا۔ زیادہ تر طالب علم آگے نکل کر گورنر ہاؤس کے قریب سے ہوتے ہوئے ڈی جے کالج پہنچ کر منتشر ہو چکے تھے۔ آئی سی پی کے اکثر لوگ بھی اسی حصہ میں شامل تھے۔

ڈی جے کالج سے منتشر ہونے کے چند منٹ ہی بعد اسمبلی اور چیف کورٹ کی عمارتوں کے پیچھے سے بے پناہ دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ جس نے ڈی جے کالج میں تمام جمع شدہ لڑکوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ طلباء بے تحاشہ دیوانہ وار صدر کی طرف لپکے جہاں دکانیں وغیرہ سب بند تھیں۔ ایک طالب علم رہنما نے پولیس وین سے طلباء کو منتشر ہو جانے کے لئے کہا اور یہ کہہ کر کہ اصل جلوس ڈی جے کالج میں جا کر پہلے سے منتشر ہو چکا ہے اور اب یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کا طلباء سے کوئی

پولیس فائرنگ سے

شہید ہونے والوں کے نام

۱: حیدر علی بوہرا، عمر ۲۱ سال (شادی شدہ) طالب علم سال اول سائنس

۲: غلام ربانی، عمر ۱۲ سال، طالب علم ہائی اسکول۔

۳: رفیق دادا، عمر ۱۴ سال، طالب علم ہائی اسکول۔

۴: منسکھ لال، عمر ۱۵ سال، طالب علم بی۔ وی۔ ایس پارسی ہائی اسکول۔

۵: ایک بنگالی طالب علم۔

۶: حفیظ اللہ، اسکول طالب علم۔

۷: ایک نوعمر جس کو پہچانا نہ جا سکا جس کے سینے اور پیٹ پر چار گولیاں لگیں۔

دوسرے شہدا

۸: دُہرا ویلیکا ملز

۹: عبدالستار موٹر سائیکل رکشہ والا

۱۰: ایک پٹھان جو اپنے چچا سے ملنے آیا تھا۔

۱۱: نعمت اللہ عمر ۲۲ سال، الفنسٹن اسٹریٹ پر ایک ڈرائی کلیننگ کا ملازم۔

یہ شہید تو وہ ہیں جن کا پتہ چل سکا۔ باقی بعض ایسے لوگ بھی پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے جن کا نام پتہ معلوم نہ ہو سکا۔ اس کے علاوہ بھی اور بہت سے طلباء و غیر طلباء گولیوں لاٹھیوں اور آنسو گیس کے بموں سے زخمی ہوئے

تعلق نہیں - لہذا طلبار کو چاہیئے کہ وہ فی الحال منتشر ہو جائیں اور اگلے اعلان کا انتظار کریں - یہ وہ طالب علم رہنما تھا جس کی آواز پر اس وقت کراچی کا ہر طالب علم اپنی جان دینے کو تیار تھا - لیکن ۸ جنوری کی دوپہر کو اس کی آواز پولیس کی اشک آور گیس کے بوجھ تلے دم توڑ گئی -

اسی دوران میں وزیر داخلہ نواب مشتاق احمد خاں گورمانی کی کار کیفے فردوس (جہاں آجکل محبوب مارکیٹ قائم ہے) سے کچھ آگے درزی کی دوکانوں کے سامنے آکر رکی - وزیر موصوف پیراڈائز سینما کے سامنے طلباء مظاہرین کے جلوس میں آکر اپنے ہونہار دانش مند بچوں کو امن کا سبق دینے لگے - ان ہونہاروں نے اس وقت تک ان کی بات سننے سے انکار کر دیا جب تک کہ پولیس اشک آور گیس کے بے دریغ استعمال سے اپنا ہاتھ نہیں روکتی - وزیر داخلہ کے حکم سے اشک آور گیس کی فائرنگ روک دی گئی - اور ان کی تقریر شروع ہوئی - لیکن اسی لمحے اشک آور گیس کے دوبارہ فائر ہونے سے طلبار اور مظاہرین مشتعل ہو گئے - گورمانی کی جان مصیبت میں پھنس چکی تھی - پولیس والے گورمانی کو بچا کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے لیکن ان کی کار نہ بچا سکے - غصہ اور نفرت کی آگ میں گورمانی کی کار نذر آتش ہو گئی - گورمانی کے حکم پر پولیس کے مسلح سپاہیوں نے نہتے طلباء پر اندھا دھند گولیاں برسانا شروع کر دیں - اور دیکھتے ہی دیکھتے سڑکوں پر خون کے فوارے چھوٹ گئے - نوجوان جسم سڑکوں پر سسک سسک کر دم توڑنے لگے - اس کے ساتھ ہی پولیس نے بڑے پیمانے پر گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا - جو بھی پولیس کے ہاتھ لگا اس کو گرفتار کر لیا گیا - جناح اور سول ہسپتال زخمیوں سے اور تھانے قیدیوں سے بھر گئے - پولیس نے مرنے والے طالب علموں کی لاشوں کا ٹھوکریں مار مار کر خیر مقدم کیا اور خوب جی بھر کر طالب علموں کے خون سے ہولی کھیلی - چار برس سے گیارہ برس تک کے بچوں پر اقدام قتل اور سازش کے الزامات عائد کر کے مقدمات درج کئے گئے

حکومت نے کالجوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں پندرہ دن کے لئے قفل ڈال کر پورے وسطی کراچی میں کرفیو نافذ کر دیا -

انجمن اساتذہ جامعہ کراچی کی قرارداد

جامعہ کراچی کے اساتذہ ۱۵ جنوری کو ہڑتال کریں گے

کراچی یونیورسٹی ٹیچرز سوسائٹی گزشتہ ایک سال سے اپنے ان بنیادی مطالبات کو منوانے کے لئے جو اصولی طور پر تعلیمی پالیسی میں تسلیم کئے جا چکے ہیں - پُرامن جدوجہد کرتی رہی ہے - اس سلسلے میں وہ اب تک چانسلر کو متعدد قراردادیں اور یادداشتیں پیش کر چکی ہے - جن میں یونیورسٹی اساتذہ کے مطالبات کو تسلیم کرنے پر زور دیا جا رہا ہے - اساتذہ کے بنیادی مطالبات حسب ذیل ہیں -

۱ - یونیورسٹی آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۲ء کی مکمل تنسیخ -

۲ - سینڈیکیٹ کی تشکیل نو اور اس میں اساتذہ کے منتخب نمائندوں کی شمولیت -

۳ - یونیورسٹی اساتذہ کے تین گریڈز اور

۴ - یونیورسٹی اساتذہ کے تنخواہوں کے اسکیل پر نظر ثانی -

یہ مطالبات آل پاکستان یونیورسٹی ٹیچرز کنونشن میں جو ۳۰ اور ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو کراچی یونیورسٹی میں منعقد ہوا تھا - اتفاق رائے سے منظور کئے گئے تھے - اور ممتاز عوامی رہنماؤں، وکیلوں، طالب علموں - دانشوروں اور ادیبوں کی جانب سے ان مطالبات کی مکمل حمایت کی گئی تھی - اس سلسلہ میں ۲۵ نومبر ۱۹۷۰ء کو ایک اخباری بیان میں صوبائی حکومتوں پر زور دیا گیا تھا کہ وہ مروجہ یونیورسٹی آرڈیننس کو منسوخ کریں اور صدارتی کابینہ کے فیصلوں پر عمل درآمد کریں -

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ حکومت نے ایک مرتبہ پھر اساتذہ کے بنیادی مطالبات کو نظر انداز کر دیا ہے - اور یونیورسٹی اساتذہ کے منتخب نمائندوں سے مشورہ کئے بغیر تنخواہوں کے نئے اسکیل کا اعلان کر دیا ہے - یہاں اس بات کا ذکر کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ تنخواہوں کے اس نئے اسکیل نے اساتذہ کے گریڈ کو کم کر کے تین کرنے کے بجائے اسے بڑھا کر پانچ کر دیا ہے - یعنی ۱ - لیکچرر - ۲ - اسسٹنٹ پروفیسر - ۳ - ایسوسی ایٹ پروفیسر - ۴ - پروفیسر - ۵ - میریٹ پروفیسر -

یہ امر حقیقتاً افسوسناک ہے کہ نئے گریڈز نے تقریباً پچاس فیصد لیکچرار کو متاثر کیا ہے اور میرٹڈ ڈی میرٹ کا امتیاز پیدا کر کے پروفیسروں کے درمیان ایک امتیازی خط کھینچ دیا ہے - اس سے ان ریڈرز اور لیکچررز کی ترقی کے امکانات بھی بری طرح سے متاثر ہوئے ہیں - جو اپنے موجودہ گریڈز کی مقررہ آخری حد تک پہنچ چکے ہیں -

اساتذہ کا یہ اجلاس عام محسوس کرتا ہے کہ اگر یونیورسٹی اساتذہ کے منتخب نمائندوں کو فیصلہ کرتے وقت یا پالیسی تیار کرنے والے یونیورسٹی کے بااختیار اداروں میں شامل کر لیا جاتا تو اس طرح کے غیر تسلی بخش پے اسکیل کبھی تیار نہ ہوتے -

اس صورتحال کے پیش نظر یہ اجلاس عام نئے پے اسکیل کو مسترد کرتا ہے

یہ اجلاس عام ایک بار پھر یونیورسٹی آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۲ء کو فوری طور پر منسوخ کرنے سینٹ بحال کرنے اور یونیورسٹی سنڈیکیٹ کو دوبارہ اس طرح تشکیل دینے کا مطالبہ کرتا ہے کہ اس میں کم از کم پچاس فیصد یونیورسٹی اساتذہ کے منتخب نمائندے شامل ہوں -

اجلاس عام حکومت سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے وعدوں پر عمل درآمد کرے - یونیورسٹی کے اساتذہ نے طلبا کے مفاد کی خاطر اور ملک میں ہونے والے عام انتخابات کی وجہ سے اس سلسلے میں اب تک انتہائی اقدامات اٹھانے سے گریز کیا ہے - لیکن بدقسمتی سے ہماری اس روش کو نہ سراہا گیا - لہٰذا اب ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ اپنے ان مطالبات کو تسلیم کرانے کے لئے جمعہ ۱۵ جنوری ۱۹۷۱ء سے ہڑتال پر چلے جائیں

ھنزہ سے چاٹگام تک

نیپ کے غبارے کی ہوا نکل گئی

لاہور —— سہراب اسلم

ہمارا خیال تھا کہ 'شیر علی' کے بکری ہو جانے کے بعد کوئٹہ کے قصاب برادری کے ایڈیٹر بھائی کی طبیعت درست ہو گئی ہو گی۔ مگر "شرمندگی" کے گذشتہ شمارے سے معلوم ہوا کہ ہمارا یہ قیاس غلط ہے۔ البتہ انداز بدلے ہیں نیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جمہوریت کے نام پر صحافت میں ذلالت کو جنم دینے والے پرچے کے مدیر نے اب ایک نیا "فارمولا" ایجاد کیا ہے۔ "ڈراؤ —— دھمکاؤ اگر پھر بھی کام نہ چلے تو خود ڈر جاؤ —— دھمک جاؤ"...!

اداریہ میں دو دھاری تلوار استعمال کی گئی ہے۔ تلوار اس لئے کہ ترازو کے دونوں پلڑے ٹوٹ کر گر چکے ہیں —— اور اب تلوار کو آزمانے کا فیصلہ معاصر شرمندگی کے مدیر چھری مار نے کو ہی لیا ہے۔ پہلی تلوار جمہوریت، رواداری اور مجیب الرحمان کی ہے۔ بھٹو صاحب کے "فکس اپ" کے جواب میں مدیر شرمندگی نے جمہوریت کے واسطے دیئے ہیں۔ مجیب الرحمان کا بیان یاد دلایا ہے جس میں انہوں نے اپنے سب مخالفوں کو "معاف" کر دینے کا "فرخدلانہ" اعلان فرمایا ہے۔ لیکن چوں کہ ابھی امریکی ڈالر کا خمار نہیں اترا اس لئے اسی اداریہ میں یہ گیدڑ بھبکی بھی دی گئی ہے کہ اگر مسٹر بھٹو نے انتخاب سے پہلے کی ان چھری مار صحافت کو معاف نہ کیا تو پورے وسائل اور قوت سے بھٹو صاحب کی مزاحمت کی جائے گی —— اس اداریہ دھمکی کا عنوان ہے۔ "پاکستان کسی کی جاگیر نہیں ——"

اس موقع پر چچا غالب بے ساختہ یاد آ گئے —

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔ ارے ظالمو یہی بات تو ہم کہہ رہے تھے کہ پاکستان کسی کی جاگیر نہیں ہے معلوم ہوتا ہے بات تو سمجھتے ہو۔ مگر سمجھنے کی حس "سیلف اسٹارٹ" نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس عوامی "دھکے" کھانے کی عادی ہے —— بالکل درست فرمایا مولانا ڈالر قریشی صاحب! بالکل بجا ارشاد ہوا "پاکستان کسی کی جاگیر نہیں ہے" —— نہ بھٹو کی اور نہ مولانا اچھروی کی —! اس کے وارث وہی عوام ہیں جنہوں نے آپ کی سیاست جاگیرداری کے تابوت میں ووٹ کا کیل ٹھونکا ہے۔

اور اب اپنی جدوجہد و جذبۂ انقلاب کے ذریعے اس تابوت میں جاگیرداری، سرمایہ داری اور سامراج کی لاش کو سمندر کی لہروں کے سپرد کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ تمہیں یہ تو یاد ہے ناں۔ لاہور میں ۵ / جون ۱۹۷۰ء کی سامراج دشمن عوامی ریلی میں مزدوروں کسانوں نے ایک بینر اٹھایا ہوا تھا۔

"سامراجیوں —— تمہیں غرق کرنے کے لئے ہمارے سمندر بہت گہرے ہیں!"

بس اب بھی ان الفاظ پر توجہ دو کہ انجام کے متعلق شک ختم ہو جائے گا۔

نیپ نے پاکستان کی تاریخ کے ایک نہایت پر آشوب دور میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ ایک وقت یہ ملک کی واحد پارٹی تھی جو "آزاد خارجہ پالیسی" صوبائی خود مختاری" ون یونٹ کا خاتمہ —— اور فلاحی مملکت کا علم بلند کئے ہوئے تھی۔ نیپ اس وقت کے ترقی پسندوں کا ایک متحدہ محاذ تھی۔ بایں ہمہ کہ اس میں شامل تمام افراد یا گروہ ترقی پسند نہیں تھے۔ مگر مجموعی اعتبار سے یہ واحد پارٹی تھی جو اپنے مزاج کے اعتبار سے سامراج دشمن اور بہت حد تک عوام دوست پارٹی۔

پھر یہی وہ پارٹی تھی جس نے ۱۹۶۴ء میں سوشلزم کو اپنے منشور کا حصہ قرار دیا۔ چونکہ نیپ مختلف الخیال اور غیر طبقاتی تنظیم تھی اس لئے اس میں تقسیم و انتشار کا عمل لازمی تھا۔ اور جوں جوں نچلے طبقات کی جدوجہد منزل بہ منزل آگے بڑھتی گئی نیپ کی طبقاتی تقسیم واضح ہوتی چلی گئی —— چنانچہ ولی نیپ، بھاشانی نیپ اور مزدور کسان گروپ یہ نیپ کے تین ابتدائی حصے بخرے ہوئے، مگر آخری الذکر گروپ نے خود کوئی ۱۹۷۰ء میں مزدور کسان پارٹی کے نام سے منظم کر کے نیپ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ ولی صاحب کو ترقی پسندوں کے اس گروپ کی تائید و اعانت حاصل تھی جو ترمیم پسند، کہلاتے ہیں۔ چونکہ عبدالولی خاں کی سیاست ان کے باپ کی سیاست کے گرد گھومتی تھی، اس لئے اس پٹھان متی کے کنبہ میں جہاں پٹھان نیشنلزم کی بات کرنے والے تھے وہاں "جبوری" طریقوں سے سوشلزم پھیلانے والے بابو سوشلسٹ بھی تھے۔ سو نیپ ولی کا کردار آپ کے سامنے ہے —— بالخصوص ولی خاں کا حالیہ بیان جو انہوں نے لاہور میں دیا ہے کہ "سرحد میں جاگیرداری کا کوئی مسئلہ نہیں ہے" ان کی تمام ترقی پسندی کا بھانڈا عین چوراہے میں پھوڑ

انتخابی سیاست میں بہت سے لوگ وفات پا گئے ہیں

دنیا ہے۔ ولی خاں صاحب خود بھی صوبہ سرحد کے اچھے بڑے خان ہیں ــــــ لہٰذا انہیں سرحد میں جاگیرداری نام کا کوئی مسئلہ نظر نہ آنا بالکل فطری ہے۔ لیکن مولانا بھاشانی نے پنجاب سے چند جاگیرداروں پر مشتمل نیپ کا جو دھڑا تختہ مشرقی پاکستان میں بیٹھے بیٹھے کیا ہے وہ قابلِ افسوس بھی ہے اور عبرتناک بھی۔!

کافی عرصہ سے بھاشانی نیپ کی حیثیت اس غبارے کی ہو چکی تھی جس کی ہوا بتدریج نکل رہی ہو۔ مگر سی آر اسلم، مولانا بھاشانی کی سیاسی تربت کے مجاور بنے بیٹھے تھے۔ یہ نیپ کے ترقی پسند اور اختلافات رکھنے والے گروپ کو یہ کہہ کر مرعوب کرتے کہ دیکھو مولانا بھاشانی کس کے ساتھ ہیں؟ مولانا تمہارے جلسوں میں آتے ہیں یا ان جلسوں میں جن کا انتظام عارف افتخار اور سردار شوکت علی جیسے جاگیردار کرتے ہیں۔۔۔ گویا مولانا کا نام ہر بیماری کے لئے اکسیر اور تیر بہدف علاج تھا۔ ایوب شاہی کے ان وفاداروں نے پنجاب میں بالخصوص عوامی تحریک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ (جن کا جائزہ پھر کسی وقت پیش کیا جائے گا)

ادھر ٹوبہ ٹیک سنگھ کانفرنس نے ان لوگوں کے دماغ بگاڑ دیئے۔ عوام کے ہجوم کو دیکھ کر مسیح الرحمان کا "حوصلہ" کچھ اتنا بلند ہوا کہ وہ اپنے منہ سے وہ کچھ کہہ گئے جس کے لئے بعد ازاں ان کی بیوی کو یحییٰ خاں سے "معافی" اور "درگزر" کی درخواست کرنا پڑی۔ اس موقع پر جب کہ نیپ بھاشانی کے دفتر میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے ہم ان کے زخموں پر نمک ہرگز نہیں چھڑکنا چاہتے۔ مگر ایک بات ضرور عرض کرنا چاہتے ہیں۔

ع جو شاخِ نازک پہ آشیاں بنے گا ناپائیدار ہوگا۔

جب سیاسی پارٹیاں جدوجہد کی بجائے موقع پرستی، اصولوں کی بجائے شخصیت پرستی اور تاریخی قوتوں کی شناخت کی بجائے خود بینی کا شکار ہو جائیں تو انجام وہی ہوتا ہے، جو نیپ بھاشانی کا ہوا۔! تاہم مغربی پاکستان میں نیپ بھاشانی مرحوم و مغفور، اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں، دیانتدار اور مخلص کارکنوں کے لئے اب بھی وقت ہے کہ وہ مصلحت پسندی اور تن آسانی کی لائن کو چھوڑ کر صحیح راہ عمل اختیار کریں۔ اگر حوصلہ اور دم خم ہو تو اپنی نئی پارٹی انقلابی اصولوں پر بنائیں۔ ورنہ جو بھی پارٹی ان کے خیالات سے قریب تر ہو اس میں شامل ہو کر انقلابی عمل میں اپنا حصہ دار کریں۔ کہ تاریخ اور عوام کو کفارہ ادا اسی طرح ہو سکتا ہے ــــــ جہاں تک نیپ بھاشانی کی مغربی پاکستان کی لیڈرشپ کا تعلق ہے۔ انہیں مشورۂ آرام کرنے کا دیا جا سکتا ہے تاکہ ان "بزرگوں" کے قیمتی مشورے نوجوان انقلابیوں کے راستے کی رکاوٹ نہ بنیں۔ ویسے بھی انتخابی سیاست میں تو یہ لوگ "وفات" پا چکے ہیں۔ اب انقلابی سیاست میں ان کا کردار کیا ہو سکتا ہے؟ پردۂ غیب سے یہ بھی جلد ظہور میں آجائے گا ــــــ

پنجاب کا دارالحکومت، پاکستان کا دل، روشنیوں کا شہر، جنگ ۱۹۶۵ء کا بیٹن گراڈ آجکل لہروں کی زد میں ہے! انتخاب کے بعد ایک لہر مہنگائی کی اور سردی کی ہے۔! دوسری لہر ہے عوامی ابھار اور انقلابی جوش و خروش کی!! تیسری لہر ہے سامراجیوں کی گلی سڑی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کی!!! اور ایک اور ان سب سے نمایاں ہے ــــــ وہ ہے ــــــ انقلاب کی لہر ــــــ! ان دنوں ہمیں ہائی کورٹ کے بعض وکلاء سے ٹیکسی ڈرائیوروں تک بات کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ انقلاب کی لہر نے دبے کچلے عوام میں اعتماد پیدا کیا ہے۔ عوام نے ایوب آمریت کا تختہ الٹا تو انہیں اپنی طاقت کا احساس ہوا۔ پھر انہوں نے دین فروشوں کا برج الٹایا تو انہیں پتہ چلا کہ "ملائیت" کے ہزاروں پھندے ان کی جدوجہد کو زنجیر نہیں پہنا سکتے ــــــ اور یہ کہ راستہ کتنا ہی دشوار کیوں نہ ہو، مخالفت کے لاکھوں طوفان، سازشوں کے ان گنت جال ان کے عزم سفر کو ماند نہیں کر سکتے۔

اور پھر بھوکے ننگے عوام کے پاس کیا ہے جس کے گم ہونے کا اندیشہ ہو۔۔۔۔۔۔ اور جینے کے لئے تو ایک دنیا پڑی ہے۔!

یہ آخری لہر سب سے جاندار ہے، اور خوش آئند بھی۔

بھٹو صاحب کے حالیہ دورۂ لاہور کی تفاصیل ملک بھر کے اخبارات میں آچکی ہے۔ پنجاب اسمبلی کے سامنے ان کی تقریر نے بہت سے شکوک جو دائیں بازو کے پیشہ ور صحافیوں، سیاسی کارکنوں اور تنخواہ دار ملاؤں نے الیکشن کے بعد پیدا کئے تھے۔ بھٹو صاحب کے اس جملے نے دور کر دیئے ہیں کہ "بھٹو کی جائیداد بھی تقسیم کی جائے گی۔!" یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ بھٹو صاحب نے جاگیرداری کے خاتمے کا جو اعلان کیا ہے اس کی ابتدا اپنے آپ سے کی ہے۔ بظاہر یہ بات ان کے طبقاتی اور ذاتی مفاد کے خلاف جاتی ہے۔۔۔ مگر وہ لوگ جو اس حیاتِ چند روزہ میں کچھ کر گزرنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ 'قربانی' اتنی مشکل بات بھی نہیں ــــــ پھر جو شخص خود کو سوشلزم کا مست ملنگ کہتا ہو اس کے لئے تو یہ اور بھی آسان بات ہے۔۔۔۔ اس اعلان کو جس کا ذکر ہم نے کیا ہے سن کر ایک دانشور ٹی ہاؤس میں کہتا سنا گیا۔۔۔۔ "کیا واقعی بھٹو ایسا کر دے گا؟ کہیں بھٹو لیجنڈری فگر LEGENDRY FIGURE ہی نہ بن جائے پاکستان کا۔۔۔؟

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ وہ لوگ جو اپنا سب کچھ عوام کو دے دیتے ہیں۔ عوام ان کے ایک اشارے پر جان تک نچھاور کر دیتے ہیں۔ کوئی آزمائے تو سہی۔۔۔۔

جاگیرداری کے خاتمہ کے سلسلہ میں عام آدمی یہ بھی کہتے سنے گئے ہیں کہ جاگیرداری کا خاتمہ اس قسم کی اصلاحات سے ہرگز نہیں ہو سکتا جس قسم کی

باقی صفحہ ۱۴ پر

انہوں نے عوام کو جیت لیا ہے



معراج محمد خان اور طارق عزیز استقبال کرنے والوں کا ہاتھ ہلا کر جواب دے رہے ہیں۔ فوٹو ظفر

نمائندہ الفتح

معراج محمد خان اور طارق عزیز، ان دنوں استقبالیوں کے آدمی بنے ہوئے ہیں۔ کراچی کے جیالے عوام انھیں سر آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں۔ انھوں نے انتخاب تو نہیں البتہ لوگوں کے دل جیت لیے ہیں۔ وہ لوگوں کے لیے جیل کی سختیاں جھیل کر آتے ہیں۔ لیاری، پارسی کالونی، ملیر، ناظم آباد، جگہ جگہ استقبالیے ترتیب دیئے جا رہے ہیں۔ حال ہی میں نارتھ ناظم آباد میں طلبہ، شہریوں اور اساتذہ کی جانب سے انھیں ایک استقبالیہ دیا گیا۔ نارتھ ناظم آباد کو کراچی والے اچھرہ بھی کہتے ہیں کیونکہ یہاں سے جماعت اسلامی کے نمائندے منتخب ہوئے ہیں۔ مگر معراج محمد خاں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ وقت کے دھارے نے جن شخصیتوں سے میرا ہاتھ چھڑوا لیا تھا آج میں اُن کے چہرے دیکھ رہا ہوں، وہ مجھے غلطی پر سمجھتے تھے لیکن میں جس پلیٹ فارم سے جدوجہد کر رہا تھا آج اُس نے عوام کو جیت لیا ہے۔ میں ان دوستوں کو یہی دعوت دوں گا کہ وہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں۔ ادھر ادھر کا لیفٹ چھوڑ دیں۔ ایک عوامی لیفٹ بنائیں۔ وہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو کر بھٹو کو اور طاقتور ہونے کا احساس دلائیں۔ پھر ذوالفقار علی بھٹو اور بارہ کروڑ عوام کی قیادت میں تمام سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور استحصال کرنے والوں کا خاتمہ کر دیں۔ میں آپ لوگوں کے کہنے پر اسمبلی سے باہر رہا ہوں کیونکہ پارلیمنٹوں نے عوام کو آج تک کچھ نہیں دیا۔ پارلیمنٹ جب بھی عوام کے خلاف کوئی فیصلہ کرے گی خواہ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کی پارلیمنٹ کیوں نہ ہو میں آپ کے ساتھ مل کر اس کے خلاف جدوجہد کروں گا۔ میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہوں گا"

عوامی فنکار اور عوامی رہنما طارق عزیز نے کہا "میں معاشرے اور فنکار کے درمیان رابطہ قائم کرنے کے لیے سیاست کے میدان میں آیا تھا۔ فنکار کہا کرتے تھے کہ انھیں معاشرے نے وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ میں اُن سے کہا کرتا تھا کہ تم نے معاشرے کے دکھوں کی کب عکاسی کی ہے۔ اب میں جدوجہد کا ایک مرحلہ طے کرنے کے بعد اپنے اسٹوڈیو میں واپس جانا چاہتا ہوں تاکہ وہاں سے فلموں کے ذریعے سوشلزم کا پرچار کر سکوں۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ سوشلزم کسی رحم دل اور نیک ذہن کی تخلیق نہیں ہے۔ یہ ظالموں کے ظلم و تشدد اور مظلوموں کی حالت زار کے درمیان ٹکراؤ کا ایک منطقی اور تاریخی نتیجہ ہے۔ اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

سوشلزم آوے ہی آوے"

مجیب اقلیتی لیڈروں کے بجائے اکثریتی پارٹی کا تعاون حاصل کریں

بقیہ صفحہ ۵ سے آگے

تھے۔ بعد میں سیاسی سرگرمیوں کی بحالی اور مجیب جولائی میں آئے تو وہ بیچ لگژری میں ٹھہرے تھے اور ان کی ایک ملاقات ولیکلا سے بھی ہوئی تھی۔ ہارون گروپ کا اخبار "ڈان" شروع سے مجیب کو صفحۂ اول اور بھٹو کو اندر کے صفحات میں جگہ دیتا رہا۔ اور جب انتخابات میں ان تمام کوششوں کے باوجود بھٹو اکثریتی نشستیں لے گئے تو ایک بار پھر سرمایہ داروں، امریکی ایجنٹوں اور استحصالیوں نے مجیب اور بھٹو کو لڑانے کی کوشش شروع کر دی۔ جماعتِ اسلامی جو مجیب کو بھارتی ایجنٹ، عوامی لیگ کو ہندوؤں کی جماعت اور رجانے کیا کچھ کہتی تھی اب اس کے ترجمان اخبارات میں عوامی لیگ کو جماعتِ اسلامی کے تعاون کی پیش کش کی جا رہی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ عوامی لیگ قرآن و سنت کے مطابق آئین بنانے کا وعدہ کر رہی ہے اس لئے ہم اس سے تعاون کریں گے۔ حالانکہ انتخابات سے پہلے بھی عوامی لیگ نے یہی کہا تھا اس وقت اس سے تعاون کیوں نہ کیا گیا۔ اب شیخ صاحب نے آئین سازی میں مغربی پاکستان کے تعاون کو ایک ضروری قرار دیا ہے، اسے جماعتِ اسلامی نے چھپانے اور اس بات کو اچھالنے کی کوشش کی ہے کہ مغربی پاکستان کے رہنماؤں سے اصولوں پر سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔

جماعت اسلامی کے علاوہ، مغربی پاکستان میں عوامی لیگ کے چھٹ بھیئے۔ بھی بھٹو اور مجیب کے درمیان نفرت پھیلانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ مجیب صاحب کو خود ہی اس بات سے خبردار ہو جانا چاہیئے کہ مغربی پاکستان میں جن لوگوں کے ہاتھ میں عوامی لیگ کی قیادت ہے انہیں مغربی پاکستان کے عوام کی تائید حاصل نہیں ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ عوامی لیگ کے تمام امیدواروں کی یہاں ضمانت ضبط ہوئی ہے۔ قاضی فیض نائب صدر عوامی لیگ، اس کی سب سے بڑی مثال ہیں۔ جی ایم سید جو عوامی لیگ کے اتحادی ہیں ان کی ضمانت ضبط ہوئی ہے۔ ان لوگوں کی مغربی پاکستان میں کوئی سیاسی حیثیت نہیں ہے، رجعت پرست اور عوام دشمن اخبارات ان بونوں کو قدآور شخصیتیں بنانے کی فکر میں ہیں۔ اس سے مغربی پاکستان میں عوامی لیگ کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اور کچھ نہیں۔ یوسف ہارون گروپ بھی اسی فکر میں ہے۔ کہ کسی طرح مجیب اور بھٹو مل نہ جائیں، یوسف ہارون کے ایک خاص ایلچی حمید نامی مجیب سے بہت پہلے مل کر بھی آئے ہیں، لیکن مجیب کی طرف سے انہیں کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں ملا۔ اس طرح ہارون کے ایک اور ایلچی پی پی آئی کے معظم علی بھی ملنے گئے تھے، انہیں سات روز کے قیام کے بعد ملاقات کا موقع ملا تھا اور وہ بھی چند منٹ۔ لیکن وہ بھی مایوس لوٹے، کیونکہ اس کے فوراً بعد مشرقی پاکستان کے عوام دوست صحافیوں نے متحد ہو کر شیخ صاحب کو خبردار کیا تھا کہ اگر آپ نے معظم علی سے کوئی رعایت برتی تو آپ کو ہمارا تعاون نہیں مل سکے گا، یوسف ہارون اور دوسری رجعت پسند طاقتیں اب تک انہیں کوششوں میں مصروف ہیں۔ لیکن مسٹر بھٹو نے اب بھی پہل کی ہے اور خود ملاقات کی خواہش ظاہر کر کے اپنے باقاعدہ ایلچی کو مجیب کے پاس بھیج کر انہوں نے فراخدلی کا ثبوت دیا ہے۔ مسٹر بھٹو کی پارٹی اور حامیوں کی طرف سے مجیب کے خلاف کوئی نفرت بھی نہیں پھیلائی جا رہی ہے، جبکہ مغربی پاکستان میں عوامی لیگ کے نام نہاد لیڈر مسٹر بھٹو کے خلاف نفرت پھیلا رہے ہیں۔ مجیب کے ترجمان مشرقی پاکستان اخبارات کا لہجہ اور مغربی پاکستان کے رجعت پرست اخبارات کا لہجہ مسٹر بھٹو کے بارے میں ایک سا ہے۔

اس وقت بھی اگر مجیب۔ گول میز کانفرنس کے دور کی طرح ان طاقتوں کے فریب میں آگئے" تو جمہوریت کی منزل اور دور چلی جائے گی۔ انہیں مغربی پاکستان کے اقلیتی لیڈروں کے فریب میں آنے کی بجائے مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی کا تعاون حاصل کرنا چاہیئے تاکہ انہیں مغربی پاکستان کے عوام کا اعتماد حاصل ہو۔

قارئین کہتے ہیں

جماعت اسلامی کی آخری پناہ گاہ

شوکت صدیقی صاحب کا مضمون "جماعت اسلامی کی آخری پناہ گاہ" "الفتح" کی ۱۷-۲۴، دسمبر کی اشاعت میں پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ جو تعریف انہوں نے خالص مہاجرین کی بیان کی ہے یعنی وہ یو، پی بہار اور حیدر آباد سے تعلق رکھتے ہیں تو میں خالص مہاجر ہوں اور میرا آبائی وطن یو پی ہے۔ شوکت صدیقی صاحب کا خیال ہے کہ خالص مہاجرین نے جماعت اسلامی کا ساتھ دیا ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔ میں نے اپنی ملازمت کی مجبوریوں کے باوجود بھٹو صاحب اور انکی جماعت کے لئے بغیر پارٹی رکن ہوئے بے حد کام کیا ہے یہاں تک کہ اپنے افسران سے بھی تلخ کلامی کی۔ آج بھی بھٹو صاحب اور ان کی پیپلز پارٹی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر سکتا ہوں۔ مجھ جیسے لاکھوں اور "خالص مہاجرین" آپ کو ملیں گے جو بھٹو صاحب اور پیپلز پارٹی پر فریفتہ ہیں اس طرح شوکت صاحب کا یہ کہنا کہ مہاجرین نے "جماعت" کا ساتھ دیا ہے میری اور مجھ جیسے لاکھوں مہاجرین کی توہین کے مترادف ہے۔ کیا شوکت صاحب، جوش صاحب اور ابراہیم جلیس کے لئے یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ "خالص مہاجرین" ہوتے ہوتے بھی جماعت کا ساتھ دے سکتے ہیں؟ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ بھٹو صاحب کے موافقین اور مخالفین دونوں مہاجرین میں اسی طرح ہیں جس طرح دوسرے صوبوں کے لوگوں میں۔

(ایک خالص مہاجر)

عوام نے ریفرنڈم جیت لیا ہے

بقیہ صفحہ ۳۷ سے آگے

اصلاحات ایوب خاں نے کی تھیں۔ کیونکہ وہ زرعی اصلاحات جاگیرداروں کے ایجنٹوں کے اشارہ پر اور ان کے قانونی مشیروں سے مشورہ کر کے ہوئی تھیں تاکہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ جاگیرداری کے خلاف ہوئی نفرت کو سرد کیا جاسکے۔ اور جاگیرداروں کے مردہ جسم، میں 'معاوضہ'، کا نیا خون بذریعہ بانڈ کمیشن منتقل کیا جا سکے۔ گھوڑی پال، خچر پال سکیم سے بھیڑ بکری پال سکیم تک ہزار ہا چور دروازے ان اصلاحات میں جاگیرداروں کے لئے کھلے رکھے گئے تھے اس کے علاوہ آراضی جو لاہور کراچی اور اسلام آباد میں رہنے والا جاگیردار کاشت نہ کر سکتا تھا اس بے آباد زمینوں کی فروخت کا بندوبست بھی اصلاحات کے نام پر ہوا۔ اور پھر اس مراعات یافتہ طبقے کے بنجر، تھور، سیم، بارانی، ٹیلے، ٹبے، دریا بیلے بھی غریب مزارعوں کو "آسان اقساط" خریدنے کا معقول انتظام کر دیا گیا اور اس ہیرا پھیری کو ایوب خان نے زرعی' انقلاب'، شاندار اصلاحات اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہا۔ یہی خدشہ اس بار بھی ہے۔ لمبی لمبی کاروں اپنے "بل ڈاگ" اور السیشن کتوں کے سمیت بیٹھنے والا جاگیردار، گلبرگ اور ہاؤسنگ سوسائٹی میں محمد شاہ رنگیلے کی داس روس کو زندہ رکھنے والا میاں صاحب یا چوہدری صاحب اور پشاور میں دہقانوں پر گولیاں برسانے والا نثار خان اور ہشت نگر کے موضع گردو کے خان خادم شاہ ابھی اس پاک دھرتی پر اپنے گناہ گار اور مظلوموں کے خون میں رنگے ہوئے ہاتھوں سمیت موجود ہے۔ کیا مسٹر بھٹو اور مجیب ان ظالموں کے گریبان تک ہاتھ ڈالنے کی ہمت رکھتے ہیں —؟ یہ وہ سوال ہے جو ہر باشعور شہری کے ذہن میں ابھر رہا ہے۔

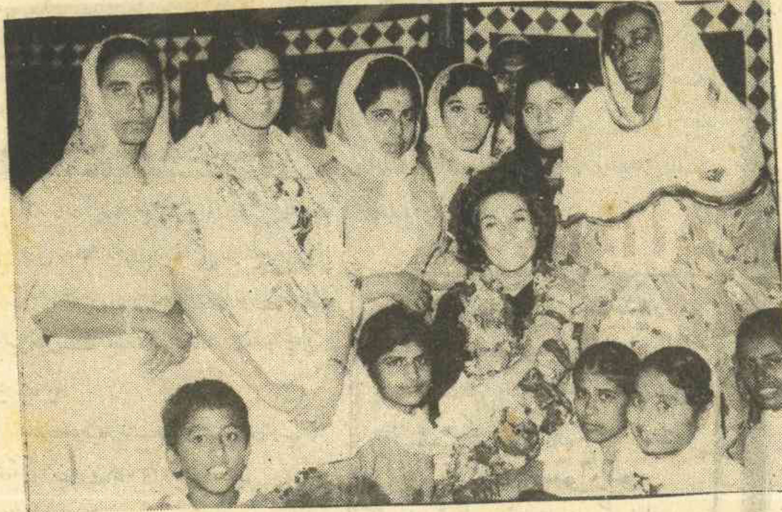
اس کے ساتھ ساتھ حدِ ملکیت کا سوال بھی اہم ہے۔ عوام نے سوشلزم کے پروگرام پر ریفرنڈم جیت لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عوام اور ان کے نمائندوں کو یہ اختیار ہے کہ وہ ملکی حالات کے مطابق سوشلزم کے اطلاق کے لئے اقدامات کریں۔ جب عملی طور پر جاگیرداری کے خاتمہ کا مرحلہ آئے گا تو سب سے ضروری بات تعین حد ملکیت ہو گا۔ لیکن یہاں لاہور میں پیپلز پارٹی کی نئی اور پرانی قیادت اس کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ میاں محمود علی قصوری حدِ ملکیت ایک سو پچاس ایکڑ بیان کر رہے ہیں جبکہ شیخ رشید ایم این اے وچیئرمین پیپلز پارٹی پنجاب کے نزدیک حد ملکیت پچاس ایکڑ ہے۔ لیکن ان دونوں قائدین کے علاوہ ان سے بھی زیادہ اہم وہ نوجوان طبقہ ہے جو پیپلز پاٹی کے ساتھ شروع سے چلا آیا ہے اور جن کی قربانیاں مثالی رہی — یہ طبقہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ جو کاشت نہیں کر سکتا اسے ایک انچ زمین رکھنے کا بھی حق نہیں ہے۔ یہی وہ بیدار مغز طبقہ ہے جس نے پنجاب میں بالخصوص اور مغربی پاکستان میں بالعموم عوام کو یہ نعرہ دیا...ہے

جیہڑا واوے اوہی کھاوے
سوشلزم آوی آوے

اسی نعرہ کا نتیجہ پیپلز پارٹی کی کامیابی ہے —

ریفرنڈم ایک سو پچاس یا پچاس ایکڑ پر نہیں ہوا بلکہ ورزمین کا شتکار کی۔ کارخانہ مزدور کا "پر ہوا ہے۔ یہ بات پیپلز کے عمائدین کے ذہن میں رہنی چاہیئے۔ ورنہ لاہور ابھی زندہ ہے۔ اور اس کے جیالے نوجوانوں کے بازوؤں کی مچھلیاں کسی بھی رجعت پسند سے ٹکرانے کے لئے مچل رہی ہیں — اس سرخ لکیر کو یاد رکھنا پیپلز پارٹی کے لئے اہم ترین ہے۔ رہا معاوضہ سوال۔

تو سوشلزم انقلابی تحریک ہے جو نچلے طبقے کی شمار قربانیوں' اور جدوجہد کے نتیجے میں نافذ ہوتا ہے معاوضہ بے شمار کسان مزدور گولیاں کھا کر، جیلوں میں جا کر اپنی اولاد (طلبا) کو سرِ بازار خاک و خون تڑپا کر دے چکے ہیں — اب کسی جاگیردار کا کوئی معاوضہ' عوام کی طرف باقی نہیں۔ اگر عوام ان کے خلاف چوراہوں میں عوامی عدالتیں لگانے کا خیال دل میں نہ لاویں تو مغربی پاکستان کے جاگیرداروں کو اسے سب سے بڑا معاوضہ سمجھنا چاہیئے — ورنہ تو پھر — ورنہ ہی ہوتا ہے —! اس لئے کہ "پاکستان کسی کی جاگیر نہیں ہے!"



بیگم نصرت بھٹو پیپلز پارٹی میں عملی طور پر بھی سرگرم ہیں۔ گزشتہ دنوں لیاری اجتماع میں انہوں نے شرکت کی تھی اس موقع پر لیا گیا ایک گروپ فوٹو

بقیہ: سفر جاری ہے

بدل جایا کرتے تھے۔ ہم جس ہوٹل میں ٹھہرتے وہاں سے ہمارے دوست کمرے چھوڑ کر چلے جاتے۔ لاہور کنونشن ہُوا تو لوگوں نے مذاق اڑایا کیوں معراج محمد خاں۔ اس وقت لوگ کہتے تھے کہ یہ کیا کر سکیں گے۔"

"دوستو! خدا کی قسم، میں ایمان سے کہہ رہا ہوں کہ اب مجھے sense of fulfilment ہونے لگا ہے۔ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں آزمائش میں سرخرو ہو رہا ہوں۔ جب میں وزارت چھوڑ کر لاڑکانہ تک آیا تھا اس وقت یہ کیفیت نہیں تھی۔ اب مجھے منزل کی بشارت ہو رہی ہے۔ اب آپ کو وعدے یاد دلانے نہیں پڑیں گے بلکہ میں آپ کو یاد دلایا کروں گا کہ میں نے یہ وعدے کئے تھے جو اب پورے ہو رہے ہیں۔"

کہنے لگے "مغربی اور مشرقی پاکستان کو صرف سوشلسٹ نظام متحد رکھ سکتا ہے۔ ہم نے مشرقی پاکستان کے کرب کا احساس آج سے چار برس پہلے کیا تھا۔ ہماری پارٹی واحد پارٹی ہے جس نے مشرقی پاکستان کے مسائل کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ مشرقی پاکستانی بھائی ہمارا منشور پڑھیں۔"

عقیدتوں اور محبتوں کا یہ سیلاب شام کے ساڑھے سات بجے تک بہتا رہا اور پھر واپسی شروع ہوئی۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ ٹرک ٹاور کے قریب پل سے گزر تا کوئنز روڈ پر گیا جہاں سے بھٹو صاحب اور باقی رہنما کاروں میں سوار ہو کر رخصت ہو گئے۔ باقی لوگوں کو اس ٹرک نے اپنے اپنے مقامات پر پہنچا دیا۔

بقیہ: سوئیکارنو

اور غالباً یہ صدر کینیڈی کی ذاتی دلچسپی کا ثمر تھا کہ ۲۲ جولائی ۱۹۶۲ء کو اچانک ایلن لارنس پوپ کو رہا کر کے جکارتہ میں امریکی سفارت خانے کے حوالے کر دیا گیا جہاں سے ایک فوجی طیارہ اس کو واپس امریکہ لے گیا۔

صدر سوئیکارنو کے خلاف آخری ترپ کا پتہ سی آئی اے نے ۱۹۶۵ء میں استعمال کیا اور پھر "اسلام خطرے میں ہے" اور "تحفظِ اسلام" کا نعرہ بلند کر کے یہ بدنامِ زمانہ امریکی ادارہ اس قابل ہو گیا کہ صدر سوئیکارنو کو اقتدار سے ہٹا کر کسی امریکہ نواز شخص کو عنانِ اقتدار سونپے تا کہ صدر سوئیکارنو کی معاشی پالیسی سے امریکی مفادات کو لاحق خطرات کا خاتمہ ہو سکے۔ اور انڈونیشیا سے ترقی پسند عناصر کا خاتمہ کیا جا سکے۔ اس طرح اسلام کا نام استعمال کر کے سی آئی اے نے وہ کام چند ماہ میں کر لیا۔ جو اٹھارہ سال سے اس کے لئے ایک چیلنج بن کر رہ گیا تھا۔

بقیہ: جماعت اسلامی کی قلابازیاں

کیا جا چکا ہے کہ فی الحال یہ تمام اقدامات "سوت نہ کپاس گولی سے لٹھم لٹھا" والی بات ہے جب تک پیپلز پارٹی برسر اقتدار آ کر پنجاب اور سندھ میں وزارتیں نہ بنالے اس وقت تک "تخریب اخلاق" کی گنجائش کہاں تک نکلتی ہے؟ اور اگر یہ حضرات اعلائے کلمۃ الحق کو اتنا ہی آسان سمجھتے ہیں تو ادھر دو چار دنوں میں "شوکت اسلام" کے پشت پناہ تاجروں نے اشیائے صرف میں گرانی پیدا کرنے کا رجحان اپنایا ہے اس پر موجودہ برسر اقتدار حکومت کو بھٹو سے کئے گئے سخت اور کرخت لہجے سے آدھے ہی سخت لہجہ میں باتیں کر کے اپنے حب وطن اور حب عوام جذبات کا ثبوت دیں۔ سوا صدر مملکت کو یا ان کے وزراء ہی کو ان کی عاقبت نا اندیشی دھمکی دیجئے اور دیکھئے کہ پھر وہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ لیکن برسر اقتدار طبقہ کو سلامت اور تدبر اختیار کرنے کی نصیحت بڑے دل گردے کا کام ہوتی ہے۔ اور کسی کی ماں، بیوی اور بیٹیوں کو طوائف کہنے والے پسندوں کو ایسے دل گردے ابھی دہیا نہیں آئے ہیں۔

قارئین کرام مبارک ہو کہ



عنقریب روزانہ شائع ہوگا

ہم نے اس سلسلے میں عوامی رہنماؤں، کارکنوں اور عوام دوست حضرات سے اپیل کی ہے کہ وہ مختلف مالیتوں کے حصص خرید کر اس عوامی جدوجہد میں حِصّہ دار بنیں ——

سب سے پہلا شیئر

پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین
ذوالفقار علی بھٹو نے

اور دوسرا شیئر

پاکستان پیپلز پارٹی سندھ زون کے چیئرمین
میر رسول بخش تالپور نے خرید کر

ہمارے حوصلے بلند کئے ہیں

تمام عوام دوست طاقتوں سے تعاون کی توقع ہے

جنرل مینجر: —— ہفت روزہ "الفتح"، ۸ ڈی، نرسری، کمرشل ایریا - کراچی

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi

7—14, JANUARY. 1971

